FEB.2023 رجب ۱۴۴۴ھ

ماہنامہ

# مظاہر علوم

سہارنپور



دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

جامعہ مظاہر علوم کا ترجمان

ماھنامہ

# مظاہرِ علوم

سہارنپور

جلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۱۰

رجب ۱۴۴۴ھ فروری ۲۰۲۳ء



زرتعاون

فی شمارہ ——— ۳۰ روپے

سالانہ زرتعاون ——— ۳۰۰ روپے

بیرون ملک سالانہ ——— ۲۵ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ مظاہرِ علوم سہارنپور ۲۴۷۰۰۱ (یوپی)

**MAZAHIR ULOOM MONTHLY MAGAZINE**

SAHARANPUR 247001(U.P.) INDIA

Ph: 0132-2655542

Email-jamiamazahir@gmail.com

# اس شمارے میں




○ دائرہ کا سرخ نشان آپ کی مدت خریداری ختم ہونے کی علامت ہے،
آئندہ کے لیے رقم ارسال فرمائیں۔

☆ شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ جواب طلب امور کے لیے لفافہ اور خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

☆ ماہنامہ، انگریزی ماہ کی ۲/تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ ۱۰/تاریخ
تک موصول نہ ہونے پر مطلع فرمائیں۔

نوائے سحر

# کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے؟

## عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

''مسلمان اس وقت اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گذر رہے ہیں'' یہ کوئی نیا عنوان اور کوئی نیا مسئلہ نہیں رہا، آئے دن اس عنوان سے مباحثے، تقاریر، سیمینار اور فکر ونظر کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں، اخبارات ورسائل میں بڑے بڑے مضامین لکھے جارہے ہیں، تجزیہ نگاری ہورہی ہے، رائے زنی کی جاتی ہے، لیکن مسئلہ ہے کہ سلجھتا ہوا نظر نہیں آرہا ہے، زخم ہے کہ مندمل ہونے کے بجائے اور بڑھ رہا ہے۔

ان حالات کی اصل اور بنیادی وجہ دین اور دینی تعلیم کا ماحول نہ ملنا ہے، لوگوں کے دلوں میں دینی تعلیم کی اہمیت نہیں رہی حالانکہ دینی علوم ہی کے ذریعہ انسان کو عرفان الٰہی جیسی عظیم نعمت حاصل ہوسکتی ہے، شاہراہِ حیاتِ انسانی تابندہ ودرخشاں ہوتی ہے اور انسانیت کو دنیا وآخرت کی فوز وفلاح حاصل ہوتی ہے، اسلامی اقدار وروایات کا شعور دینی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے، صحیح عقائد اور دین کی بنیادی جانکاری کے بغیر نہ اسلام کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ اس کے احکام کی صحیح معنوں میں تعمیل کی جاسکتی ہے، اور مسلمانوں کی معاشی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی زبوں حالی کی بنیادی اور اصل وجہ مسلمانوں کا اپنے مرکز، اپنی اساس اور اپنی بنیاد، دین سے دوری، قرآن وسنت، اسلامی تعلیمات، اسلامی شعائر اور دینی اقدار سے ناواقفیت ہے۔

آج اسلامی فکر وتہذیب کا بقاء واستحکام کس قدر خطرے میں ہے اس کا اندازہ خوب کیا جارہا ہے، ہمارے ملک ہندوستان کی موجودہ بدلتی ہوئی صورتِ حال سے ہر صاحب فہم وادراک واقف ہے۔

امت مسلمہ علمی، تہذیبی، سماجی، معاشی، دفاعی اور سیاسی شعبوں میں اپنی برتری ایک ہزار سال تک برقرار رکھنے کے بعد جب زوال پذیر ہوئی تو اس کے دو بنیادی اسباب تھے، ایک تو اس کی اپنے نظریہ حیات سے مستحکم وابستگی میں کمزوریاں درآئیں اور دوسرے اس کی حریف صلیبی اور یہودی قوتوں کی سازشیں، جنہوں نے نہ صرف مسلم معاشرے کو مغلوب کیا بلکہ اس پر قبضہ کرکے اسے اپنے فکر ونظر کے مطابق بدل ڈالا تاکہ

مسلمان آئندہ کبھی سر نہ اٹھاسکیں اور ہمیشہ ان کے غلام رہیں، استعماری طاقتیں اپنے اس منصوبہ میں بڑی حدتک کامیاب ہوگئیں اور مسلمانوں کی عملی کمزوری سے انھوں نے فائدہ اٹھا کر اپنے نظریہ اور فکر کی ترویج کی ، دینی مزاج اور صحیح الفکر افراد اور جماعتوں نے اس دام ہمرنگ زمین کو سمجھنے اور امت مسلمہ کو سمجھانے کی کوششیں اور اس سے ممکنہ حدتک بچنے کی تدابیر بھی اختیار کرکے امت کو اس سے روسناش کرایا لیکن مغرب کا یہ ریلا اتنی تیزی سے آیا کہ تمام ترکوشش اور جدوجہد بے کار تو نہیں البتہ کم اثر ثابت ہوئیں۔

تعلیم ایک خاموش انقلاب لاتی ہے اس کے لیے نعروں کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے لیے کسی اسلحے اور ایٹم بم کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے حکومتی امداد کی بھی ضرورت نہیں، مقامی مسلم آبادی کو متحرک کیا جائے اور انہیں تعلیم وتربیت کی اہمیت بتائی جائے تو یقیناً اتنے وسائل مہیا کئے جاسکتے ہیں جن سے معقول دینی تعلیم کا نظم کیا جاسکے۔ جہاں سے بڑی تعداد میں ایسے افراد تیار ہونا شروع ہوجائیں گے جو اپنی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے ہوں گے اور وہ اسلامی اقدار کے پشتیبان ہوں گے، اسلامی اقدار وروایات سے واقف ہوکر پورے معاشرے کے لئے رہبر ورہنما ثابت ہونگے۔

معاشرہ چونکہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے لہٰذا اگر فرد کی صحیح تعلیم وتربیت کا فعال اور مؤثر نظام وضع ہوجائے تو معاشرے کے سدھرنے اور صحیح سمت میں اس کی پیش رفت کے امکانات غالب ہوجائیں گے، معاشرے کی ترقی اور عروج کے لیے فرد کی اصلاح اور ترقی نہ صرف اسلامی اصولوں کے مطابق ہے بلکہ فطری اصول کے عین مطابق بھی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب مسلمان دین حق سے منحرف ہوگئے، اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ روشن ہدایات و تعلیمات سے چشم پوشی اختیار کرلی، احکام خداوندی سے روگردانی کرلی، دنیا پرستی عیش پسندی، جھوٹی شان وشوکت کے دلدادہ ہوگئے، مختلف قسم کے آپسی اختلافات میں مبتلا ہوگئے، یہود ونصاری اور دوسری قوموں کی نقالی شروع کردی، انہیں دوست بنانے اور ان کی حمایت کے حصول کے لیے ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے شروع کردیئے اور یہود ونصاری اور دوسری قوموں کی ان تمام خرابیوں اور برائیوں میں مبتلا ہوگئے، جن سے انتہائی سخت تاکید کے ساتھ باز رہنے کو کہا گیا تھا، ایسی صورت میں وہی دشمن عناصر اور وہ قومیں جنھیں مغضوب اور ضالین کے خطابات سے نوازا گیا تھا، نظام عالم پر بڑی ہی آسانی اور سرعت کے ساتھ قابض

اورمتصرف ہونے لگیں، یہ سب اس لیے ہوا کہ مسلمانوں میں دینی تعلیم کے حصول کا رجحان ختم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے اللہ اوراس کے رسول کے احکامات کو بھلا دیا، اسلامی اقدار وروایات سے دور ہوتے چلے گئے، قرآن کریم میں تو خالق اکبر جل مجدہ صاف صاف اعلان کررہا ہے

**وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک (النساء: ۷۹)**

''اور جو بھی مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرا اپنے کسب وعمل کی بدولت ہے''۔

**ان اللہ لا یظلم الناس شیئا و لکن الناس انفسھم یظلمون (یونس: ۴۴)** ''حقیقت یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں''۔

اوران کی یہ حالت اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک کہ اس کے بدلنے کے لیے خود کو نہ بدلا جائے: **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم (الرعد: ۱۱)** بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی''۔

اغیار کا ظلم، دشمنان اسلام کی مذموم سازشیں، کفار ومشرکین کی مخالفتیں ان سب کا صرف ایک سبب ہے اور وہ مسلمانوں کا دینی تعلیم سے دور ہونا، آج مسلمان اپنے عمل و کردار سے دنیا کو دین بیزار باور کرارہے ہیں، مادیات کی چمک دمک کے دلدادہ ہوتے جارہے ہیں، مسلمانوں کو اپنی تو اپنی اپنی نئی نسل تک کی بھی پرواہ نہیں ہے، دینی تعلیم کے حصول سے دور رکھ کر غیروں کے ترتیب دیئے ہوئے تعلیمی نظام سے ان کو مربوط کرکے ان کا مستقبل تاریک سے تاریک تر بناتے جارہے ہیں، اوران سے اسلامی اقدار روایات کے تحفظ کے خواہاں ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ان کی ذاتی بے حسی، جدوجہد کی کمی اور جہالت ہے، اس کی وجہ سے امت میں تعلیمی انقلاب کا جذبہ جس انداز سے ہونا چاہئے وہ حاصل نہیں ہو پا رہاہے، تعلیمی اور معاشی پسماندگی دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلم امت خود بیدار ہو، اوراسے اپنا اہم مسئلہ سمجھ کر جدوجہد کرے۔

معاشرتی ترقی کے سلسلے میں محض سماجیات کی تعلیم ہی مسئلہ کا حل نہیں جیسا کہ بعض اہل دانش کا خیال ہے بلکہ معاشرہ کو اسلامی تقاضوں کے مطابق اُستوار کرنا ہوگا اور یہ چیز علم کو عمل کے دائرہ میں لائے

بغیر ممکن نہیں۔

معاشرہ کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کے لئے عزم پیہم اور جہدِ مسلسل سے گزرنا ہوگا، یہ داستانِ عزم ووفا بڑی دشوار گزار اور قربانیوں کی متقاضی ہے، جب تک اس مشن کے حامل ووارث علم وعمل سے مزین ہوکر مخلصانہ اور مشترکہ مساعی بروئے کار نہیں لائیں گے، اس وقت تک اُنہیں مطلوبہ نتائج کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں ملک دشمن عناصر کا جواب دینے کے لئے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور دینی شعور کا پیدا ہونا انتہائی اہم اور ضروری ہے، اس لئے کہ تعلیم ایک خاموش انقلاب لاتی ہے، اس کے لیے نعروں کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے لیے حکومتی امداد کی بھی ضرورت نہیں، مقامی مسلم آبادی کو متحرک کیا جائے اور انہیں تعلیم وتربیت کی اہمیت بتائی جائے تو یقیناً اتنے وسائل مہیا کئے جاسکتے ہیں جن سے مقامی سکول وکالج کو چلایا جاسکے، البتہ اس اسکول کا نصاب مغربی تعلیم کا چربہ نہ ہو، بلکہ یہ نصاب اسلامی نظریۂ علم اور اسلامی کلچر پر مبنی ہو، ان اسکولوں میں مسلم طلبہ کو نہ صرف صحیح خطوط پر تعلیم دی جائے بلکہ ان کی تربیت بھی کی جائے ،یعنی تعمیر سیرت اور کردار سازی اس کا لازمی حصہ اور نتیجہ ہو، اس سے بڑی تعداد میں ایسے افراد تیار ہونا شروع ہوجائیں گے جو قوم وطن کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ ہونگے، ملک کی تعمیر وترقی کے لئے مثبت کردار ادا کریں گے، جو خود اپنی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے ہوں گے اور اپنے عمل وکردار سے دوسروں کے لئے راہ عمل متعین کریں گے اس طرح سے تعمیر ملک وملت کی فضا ہموار ہوگی۔

آج ہم پھر سے اسلامی تعلیمات کو عملی جامہ پہنائیں، اپنا عملی رشتہ قرآن مجید سے استوار کریں اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالیں دنیا کی کوئی بھی طاقت بجز قرآن مجید کے مسلمانوں کو زندہ نہیں رکھ سکتی ،مسلمانوں کے تحفظ کی گارنٹی صرف اور صرف وہ اسلامی اخلاق واقدار ہیں جن کی طرف رہنمائی قرآن پاک نے فرمائی ہے انتم الاعلون إن کنتم مومنین ”اے مسلمانوں سربلندی وافتخار تمہارا ہی مقدر بن کے رہے گی، اگر تم سچے پکے ایماندار بن کر رہو گے“ ایک دم صریح اعلان ہے۔

درسِ قرآن

# تقاضائے بندگی

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (سورۃ الانعام: )

تم کہہ دو کہ بلاشبہہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے، جو تمام عالم کا رب ہے۔

اس آیت پر سرسری طور سے بھی گذرنے والا بداہۃً سمجھ لے گا کہ انسان کی زندگی اور اس کی موت، سب کا محور و مقصد اللہ کی ذات ہونی چاہئے۔ وہ جو کچھ کرے اللہ ہی کے لئے کرے، کوئی اور غرض اس کے پیش نظر نہ ہو۔ یہ مقصد اگر نگاہوں کے سامنے رہے تو گناہوں اور نافرمانیوں کی نجاستیں خود بخود دور ہو جائیں گی، کیونکہ کوئی گناہ اللہ کے لئے کیا جائے، ممکن ہے ہی نہیں! جس نے اپنی زندگی اللہ کی ذات سے وابستہ کر دی، وہ نافرمانیوں کی آلودگی سے صاف بچ نکلا۔ اس سے اگر کبھی کوئی قصور ہوگا تو معافی تلافی کے بغیر اسے چین نہ ہوگا۔

دنیا کے مختلف مذاہب اور نظریات انسانی زندگی پر کس نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں، اور اس کا کیا محور و مقصد متعین کرتے ہیں، اور پھر اس کی بنیاد پر انسانی زندگی کو کن کن راہوں پر گزارتے ہیں، یا گزارنا چاہتے ہیں؟ یہ تلاش و تحقیق کا ایک وسیع میدان ہے۔ ہم مسلمانوں کو جو دین و مذہب خالق کائنات جل مجدہ کی جانب سے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس واسطہ سے ملا ہے، ہمارا مرکز نگاہ وہی ہے، ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کا کیا مقصد و موضوع متعین کیا ہے؟ اور اس نے زندگی کے کن کن مرحلوں میں کیا کیا ہدایات جاری کی ہیں؟

یہ وہ مقصد زندگی ہے جو ہر لمحہ انسانیت کو ترقی دیتا رہتا ہے۔ اس کی صرف عبادتیں ہی وجہ خوشنودیٔ پروردگار نہیں رہتیں، بلکہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ سراپا عبادت بن جاتا ہے، اور جب یہی مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے تو اس کا ہر عمل بے روح ہو جاتا ہے۔

بڑی عجیب بات ہے کہ ایک وہ شخص جس نے اپنی عقیدت و محبت کو اللہ کی بارگاہ میں اُستوار کیا ہو، وہ اس سے غافل ہو کر دوسری چیزوں میں الجھ جائے۔ انسان اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے فانی ہے، لیکن

جب اس کی نسبت ذات، حی وقیوم کے ساتھ درست ہوجاتی ہے تو بقاء ودَوام کی شان اس کے اندر بھی آجاتی ہے، اسی نسبت کو قائم کرنے اور اُستوار رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب نازل فرمائی، اپنے پیغمبر کو بھیجا، کہ وہ کتاب کی تشریح وتبیین کر کے ایک صاف ستھری شریعت پر لوگوں کو چلنا سکھائیں، یہی شریعت صراطِ مستقیم ہے اور اسی پر چل کر انسان نجاتِ ابدی کا مستحق ہوتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ انسان محض اپنی عبادت کو سنوارے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی عادات وحاجات اور ضروریات وتقاضوں کو بھی اسی دائرے میں رکھے جو شریعت نے متعین کیا ہے۔

انسان اپنی زندگی کے ہر رُخ سے معلوم ہو کہ خود مختار نہیں ہے بلکہ کسی کا غلام ہے، کسی کی بندگی ہی اس کی زندگی اور اس کی روح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا (الفرقان)

رحمن کے بندے وہ ہیں کہ زمین پر تواضع سے چلتے ہیں، اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو سلامتی کی بات کہتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے! رحمن کے خاص بندوں کی جو پہلی قابل تعریف صفت حق تعالیٰ نے ذکر کی ہے وہ از قبیل عادات ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں عبادات میں آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہے، وہیں عادات وضروریات میں بھی اسے اسی طریقہ کی پابندی کرنی ہے، جو حق تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعہ ہم پر ظاہر کیا ہے۔

انسانی زندگی کے طبعی حاجات وضروریات کا دائرہ اچھا خاصا وسیع ہے، لیکن کوئی ضرورت وحاجت ایسی نہیں ہے جس کی تکمیل یا اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ورہنمائی موجود نہ ہو، اور اس سے فائدہ اٹھا کر آدمی اسے خوشنودیٔ پروردگار کا سامان نہ بنالے، لیکن اس حاجت وضرورت کو برتنے والا جب اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر اپنی خواہش کے مطابق برتتا ہے تو بسا اوقات اس کے اوپر وبالِ جان ثابت ہوتی ہے۔

مسلمانوں! ہمارا دین ایک مکمل دین ہے، اس میں نہ اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ کمی کرنے کی اجازت ہے، اس کے دائرے میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے لئے ہے، اور اس دائرے سے باہر نکلئے تو محض دنیا ہے، جو ہمارے مقصود وموضوع کے خلاف ہے، اللہ کی خوشنودی اسی دائرے میں ہے جسے شریعت نے متعین کردیا ہے، اس کے باہر کوئی چیز قابل قبول نہیں ہے۔

# تمہاری غیرت قومی کو ہے باطل نے للکارا

## کلام — حضرت مولانا فضل حق عارفؔ خیرآبادی

استاد مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیرآباد/ مئو

مسلمانو! تمہارے سر پہ وقت امتحاں آیا
فضائے ہند پہ ظلم و ستم کا ابر ہے چھایا
مٹانے پر تلا ہے تم کو طوفانوں کا اک دھارا
تمہاری غیرت قومی کو ہے باطل نے للکارا

بڑھاؤ اب قدم دل میں کرو وہ حوصلہ پیدا
جو ایوان حکومت میں بھی کردے زلزلہ پیدا

اٹھو جمہوریت کے نام کا نیلام ہوتا ہے
زمانے بھر میں رسوا اب وطن کا نام ہوتا ہے
یہاں ہر ''گوڈسے'' کا دھوم سے اکرام ہوتا ہے
وطن میں عدل کا ہر سمت قتل عام ہوتا ہے

بناؤ اب سے قرطاسِ وطن پہ اک نیا نقشہ
تو پھر ہوگا نہ عارفؔ دیکھ لینا مسئلہ پیدا

لگائی شورش دوراں کو تم نے ٹھوکریں اکثر
وطن کو خون سے سینچا ہے تم نے شاملی جاکر
تمہارے خون کے شاہد ہیں بالاکوٹ اور بکسر
تمہیں منزل پہ پہنچے ہو اسیر مالٹا بن کر

اسی عنوان سے تاریخ کا پھر باب ہے لکھنا
چٹانوں میں تمھیں کرنا ہے بڑھ کے راستہ پیدا

انوارِ حدیث

# بہترین پڑوسی

## حضرت مولانا زین العابدین صاحب اعظمیؒ

عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ یقول :قیل النبی صلی اللہ علیہ وسلم :یا رسول اللہ! إنَّ فُلانَةَ تقومُ اللَّيْلَ وَتَصُوْمُ النَّهَارَ، وَتَفْعَلُ، وَتَصَدَّقُ، وتُوذِیْ جِيْرَانَها بِلِسَانِهَا؟فَقَال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :لاَ خَيْرَ فِيْهَا هِيَ مِنْ أَهْلِ النَّار۔قالوا :وَفُلانَةُ تُصَلِّی الْمَكْتُوْبَةَ وَتَصَدَّقُ بِأَثْوَارٍ، وَلا تُؤْذِیْ أَحَداً، فَقَال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :هِیَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ اے اللہ کے رسول! بے شک فلاں عورت رات کو اٹھ (کرعبادت کر) تی ہے، اور اور دن کو روزہ رکھتی ہے، اور کام بھی کرتی ہے اور خیرات کرتی ہے لیکن اپنی زبان (درازی) سے اپنے پڑوسیوں کو ستاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس میں کوئی بھلائی نہیں وہ جہنمیوں میں سے ہے۔لوگوں نے کہا اور فلاں عورت فرض نماز پڑھتی ہے اور پنیر کے ٹکڑوں کو خیرات کرتی ہے اور کسی کو نہیں ستاتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ جنتیوں میں سے ہے۔

**فائدہ**: پڑوسی کے ساتھ نیک برتاؤ اتنی بڑی دولت ہے کہ روزہ نماز اور دوسرے اعمال خیر کا ذخیرہ اگر چہ بہت کم ہو لیکن پڑوسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دے، تو آدمی جنتی ہو جاتا ہے اس کے مقابلہ میں نوافل کا کافی ذخیرہ موجود رہتے ہوئے اگر پڑوسی کو زبان درازی سے تکلیف پہنچائے تو جہنم میں داخل ہونے کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اگر دوسرے حقوق بھی غصب کررہا ہو تو بدرجہ اولیٰ اس سزا کا مستحق ہو جائے گا۔

عن ابی ہُریرۃ أنَّ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ :لاَيَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لاَيَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کی آفتوں سے اس کا پڑوسی مطمئن نہ رہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ بوائق بائقۃٌ کی جمع ہے اس کے معنی ہیں، الغائلۃ، الداہیۃ، الفتک یعنی تباہی، مصیبت، اچانک قتل کردینا، خلاصہ یہ ہے کہ ایک پڑوسی کو اپنے پڑوسی سے یہ خطرہ ہے کہ کوئی تباہی یا کوئی مصیبت مجھ پر ڈال دے گا یا اس کو یہ اندیشہ ہے کہ پڑوسی اچانک مجھ کو قتل کردے گا، تو جس سے یہ خطرہ محسوس کیا جائے وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، یا تو بالکل نہیں، یا شروع شروع میں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح میں یہ فرمایا کہ: ایک آدمی جانتا ہے کہ پڑوسی کو تکلیف پہنچانا حرام ہے پھر بھی اپنے پڑوسی کو تکلیف پہنچانا حلال سمجھتا ہے تب تو وہ کافر ہے وہ جنت میں بالکل نہ جاسکے گا، دوسری شکل یہ ہے کہ وہ ایذاء کی حرمت کو جانتے اور مانتے ہوئے تکلیف پہنچاتا ہے تو یہ فسق ہے، کفر نہیں وہ تو کسی نہ کسی وقت جنت میں جائے گا، اب اس کے جنت میں نہ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسے شخص کا بدلہ یہی ہے کہ جس وقت فوز وفلاح والوں کے لیے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں تو اس وقت ایسے شخص کو روک لیا جائے، اور اس کو جنت میں نہ جانے دیا جائے، پھر ایذا رسانی کی سزا بھگت کر یا مراحم خسروانہ کی بنیاد پر معافی مل جانے پر جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے۔

## مغفرت کا دن

جمعہ کا دن اتنا مبارک ورحمت والا ہے کہ اگر کوئی شخص اس دن پانچ کام کرے تو اس کے لیے مغفرت اور جنت کی خوشخبری ہے۔

ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو کوئی یہ پانچ کام کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت والوں میں شامل فرمادیتے ہیں (۱) جو بیمار کی عیادت کرے (۲) مسلمان بھائی کے کفن دفن میں شریک رہے (۳) دن میں روزہ رکھے (۴) نماز جمعہ کے لیے حاضر ہو (۵) غلام آزاد کرے۔ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ ۶/۷)

راہِ عمل

# طالب علم اور اہل علم کا نصابِ زندگی

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

قرآن کریم کی ایک آیت ہے: فَلَوْ لَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ یہ آیت تو مختصر سی ہے، لیکن درحقیقت یہ اہل علم کا پورا نصاب تعلیم ہے، صرف نصاب تعلیم ہی نہیں، بلکہ نصاب زندگی ہے، طالب علم کو، اہل علم کو کیا کرنا ہے؟ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّين تک یہ بات بتائی گئی کہ جو طائفہ علم دین حاصل کرنے کے نام پر جمع ہوا ہے، اس کا کام یہ ہے کہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کرے، محض تعلیم حاصل کرنا مقصود نہیں، دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے اور سمجھ بوجھ اس کو کہا جائے گا جب علم کے ساتھ عمل بھی ہو۔

## علم کا مقصود اور ہماری کیفیت

''تفقہ فی الدین'' کا لفظ قرآن میں اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ علم کے ساتھ اور اس کے پیچھے پیچھے عمل آئے اور آپ کو یہ محسوس ہو کہ اگر ہم نے ہدایہ پڑھی، قدوری پڑھی، کنز پڑھی، ان میں معاملات کا باب پڑھا کہ فلاں معاملہ جائز ہے، فلاں ناجائز ہے، یہ حرام ہے، یہ مکروہ ہے، یہ مستحب ہے، اگر ہم بازار میں جا کر اپنے وہ اسباق یاد نہیں کرتے تو ہمارا پڑھا لکھا بے کار ہے، اب تو ہمارا حال یہ ہے کہ کتاب مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے، مدرسہ سے باہر اس کتاب کا کوئی اثر ہمارے وجود میں نہیں ہوتا، معاملات کرنے کے لیے چلیں تو ہمیں کچھ فکر نہیں ہوتی کہ ہم سچ بول رہے ہیں یا جھوٹ، جو جی چاہتا ہے کہہ دیتے ہیں، تجارت کرنا ہو، بیچنا ہو یا خریدنا ہو، جو جی میں آیا کہہ دیا اور کچھ فکر نہیں کہ ہم یہ غلط کر رہے ہیں یا صحیح۔

علم کے ساتھ معاملات اگر پڑھیں تو آپ کے معاملات کی درستگی ہونی چاہیے، محاسبہ کرو اپنے معاملات کا، آداب اور اخلاق پڑھیں، قرآن وحدیث سارا بھرا ہوا ہے ان آداب واخلاق سے، عادات اور معاشرت سے، سارے قرآن وحدیث میں اس کی تعلیم دی گئی ہے، جو کچھ بھی پڑھا ہے، اس کا اثر آپ کے اعمال پر ہونا چاہیے، دل پر ہونا چاہیے، وہ آدمی پہچانا جانا چاہیے اس چیز سے کہ یہ علم دین پڑھتا ہے، اس کے

چہرے سے معلوم ہو، اس کے عمل سے معلوم ہو، پہلے تو عام مسلمانوں کا یہ رنگ تھا کہ محض ان کو دیکھ کر لوگ ان کو پہچانا کرتے تھے کہ یہ مسلمان ہیں ''الذین اذا رأو اذکر اللہ'' جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ کرنے کا کام ''تفقہ فی الدین'' ہے، دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے، یہ ساری کائنات کا حاصل ہے، آٹھ برس جو آپ مدرسے میں رہ کر کچھ سیکھیں گے، پڑھیں گے ان سب کا حاصل یہی دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ علم کے ساتھ عمل ہو، آپ کے اعمال پر، آپ کی چال ڈھال پر اور آپ کی حرکت وسکون پر علم کا اثر ہو، یہ ہے ''تفقہ فی الدین''۔

## دینی طلبا کی کوتاہ نظری

آگے فرمایا جاتا ہے کہ ''تفقہ فی الدین'' حاصل ہو گیا، آپ مدرسے سے پڑھ کر فارغ ہو گئے اور فرض کرو جیسا ہونا چاہیے، ویسے ہو گئے، دین کی سمجھ بوجھ بھی حاصل ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل بھی دے دیا، آگے کیا کرنا ہے؟ آپ کے پیش نظر کیا ہوگا؟ آج کی دنیا میں کالج اور یونی ورسٹی اور اسکولوں کے طالب علم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ڈگری ملے گی تو سرکاری دفتروں میں نوکری ملے گی، آپ کے یہاں تو یہ قصہ نہیں، آپ کی سند اور ڈگری پر تو کوئی نوکری نہیں، لیکن بدقسمتی سے کہوں یا خوش قسمتی سے، کچھ نوکریاں یہاں بھی ملنے لگیں، ہماری سند پر اور ہمارے اس فارغ ہونے پر، کہیں مدرسہ کی مدرسی اور کہیں کسی مسجد کی امامت وخطابت وغیرہ۔

## انذار وتبلیغ کی عمومیت

اس جگہ قرآن نے وَلِیُنذِرُوا قَوْمَهُم کہا ہے، مقصد کے اعتبار سے غور کرو، تو یہ مفہوم عام ہو جائے گا، مراد یہ ہے کہ جو لوگ علم دین حاصل کرنے سے قاصر رہے ہے، اس واسطے کہ ان کو جہاد کرنا تھا، اس میں وہ لوگ بھی شامل ہو جائیں گے جو دوسری جائز چیزوں کی وجہ سے قاصر رہ گئے، جیسے تجارت پیشہ لوگ ہیں، زراعت پیشہ لوگ ہیں، کاشت کاری اور مزدوری کرنا یا تجارت کرنا دین کے فرائض میں سے تو نہیں ہے، اپنی دنیاوی ضروریات اور جائز ضرورت، حلال ضرورت کے مطابق لگ کر تجارت میں لگ گئے، مزدوری میں لگ گئے، صنعت میں لگ گئے یا کسی اور کام میں لگ گئے اور اس واسطے ان کو علم دین حاصل کرنے کی فرصت نہ مل سکی تو تمہاری ذمہ داری ہے کہ ان کو پہنچاؤ، جن لوگوں نے علم دین پڑھا ہے، ''تفقہ فی الدین'' حاصل کیا ہے، ان کی ذمہ داری لگا دی کہ ان لوگوں کو علم دین پہنچاؤ، جنہیں کسی جائز وجہ سے علم

دین حاصل نہیں ہوسکا، خواہ جہادوجہ ہو یا دوسری وجوہ ہوں، جن کو شریعت میں جائز قرار دیا ہے۔

## تبلیغ وتعلیم کا فرق

پہنچانا کیا ہے؟ پہنچانے کی دو قسمیں ہیں، قرآن نے اس جگہ تفصیل نہیں کی، جو امانت علم دین کی آپ نے حاصل کی ہے، وہ دوسروں تک پہنچانے کی دو قسمیں ہیں، ایک تعلیم، دوسری تبلیغ، تعلیم وتبلیغ میں فرق سمجھتے ہو یا نہیں؟ تبلیغ کے معنی ایک کلمہ کو پہنچادینے کے ہیں، ایک بے علم کو واقف کردینا، ایک شخص کو علم نہیں ہے، مسئلہ کا، اس کو مسئلہ بتادینا، یہ تبلیغ ہوگئی، ایک شخص کو ایمان کی حقیقت معلوم نہیں، اس کو بتادیا کہ اللہ ایک ہے اوراس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنا حرام ہے، تبلیغ ہوگئی۔ تعلیم کہتے ہیں، دین کو تھوڑا تھوڑا ترتیب کے ساتھ پورا بتانا، تبلیغ میں تو یہ کہہ دیا کہ نماز پڑھا کرو، اب جاکر تم نماز پڑھو، تعلیم میں اسے تمام آداب وقواعد سکھانے پڑھیں گے، تعلیم کا لفظ عربی لغت کے اعتبار سے بھی آتا ہے، تھوڑا تھوڑا آہستہ آہستہ سکھانا، تعلیم کا ترجمہ سکھانا ہے اور تبلیغ کا ترجمہ پہنچانا ہے، ان دونوں لفظوں میں اردو زبان کے اعتبار سے بھی فرق ہے، سکھانا اور پہنچانا کسی کو، ایک بات پہنچادی یہ اور چیز ہے اور کسی کو کام سکھانا اور چیز ہے۔

## انذار کا مفہوم

قرآن مجید نے اس آیت میں اہل علم کا مقصد زندگی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بتایا، انذار، اب غور کرو قرآن کے الفاظ میں کہ قرآن نے تبلیغ نہیں کہا، قرآن کے ایک ایک حرف اور ایک لفظ میں عجیب وغریب نکات ہیں، مگر افسوس یہ کہ نہ قرآن کو کوئی اس نیت سے پڑھتا ہے، عوام کے تو کہنے کیا ہیں، عالموں کو فکر نہیں، ہر بات میں ذرا ذرا سے ردوبدل سے بڑا فرق اور بڑے دوررس فوائد پیدا ہوجاتے ہیں۔ انذار کا مفہوم سمجھیں، انذار کے لفظی معنی ڈرانے کے ہیں اور اسی لیے نذیر ڈرانے والے کو کہا جاتا ہے، انبیاء کی شان میں بشیر ونذیر دونوں صفت آتی ہے، بشیر اس واسطے کہ وہ نیک کام کرنے والوں کو خوش خبری سنانے والے ہیں اور نذیر (ڈرانے والے) اس لیے کہ وہ جہنم سے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں، لیکن مطلق ڈرانے کے معنی نہیں، عربی لغت کو اللہ تعالیٰ نے عجیب خوبی عطا فرمائی ہے، اس کے عجیب خواص ہیں، ڈرنے کے معنی میں خوف کا لفظ بھی آتا ہے، نذیر کا مادہ بھی خوف کے معنی میں آتا ہے، خوف تو ہے ہی اور بہت سے الفاظ آتے ہیں خوف کے معنی میں، حذر بھی خوف کے معنی میں آتا ہے۔

## جدید وقدیم طلبا اور اساتذہ کا طرزِ عمل

ہمارے آج کل کے جو شاگرد ہیں، خدا بچائے ان شاگردوں سے، ان سے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ہماری ٹوپی نہ اتار لیں، ہم یہاں سے اٹھ کر جائیں تو ہماری قیمت نہ چلی جائے، جن طالب علموں کو ہم نے پڑھایا تھا، ان کو ہم تو مارا پیٹا کرتے تھے، برا بھلا کہنا، ڈانٹ دینا، نکال دینا، یہ تو روزمرہ کا دھندہ تھا، ذرا سی بات پر بھی، کسی کی مجال نہیں تھی کہ استاد کے خلاف کوئی بات کہے، ہمارے طالب علمی کے زمانے میں تو اچھا خاصا یہ معمول تھا کہ پیٹا جاتا تھا، ہمارے ادب کے استاذ حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ یاد آیا، ہم نے ادب کی ساری کتابیں مفید الطالبین سے لے کر حماسہ تک اتفاق سے ان سے پڑھی ہیں، ایسا اتفاق کم ہوتا ہے کہ ایک فن کی ساری کتابیں ایک استاذ سے آدمی پڑھے، مگر ہماری کچھ رعایت بھی کی جاتی تھی، دارالعلوم میں اللہ کے فضل سے سب اساتذہ خوش تھے، اس واسطے ہماری رعایت کرتے تھے اور ہم یہ چاہتے تھے کہ ہماری ادب کی ساری کتابیں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہوں۔

''مفید الطالبین'' ہم نے شروع کی، مفید الطالبین کے پڑھاتے پڑھاتے ہماری ''صرف نحو'' انہوں نے پکی کرادی۔ ''الباب الاول'' پر پہنچے، جو کہ مفید الطالبین کا پہلے باب کا عنوان ہے، الباب یہ فعل ہے، اسم ہے یا حرف؟ اب ہم بغلیں جھانکنے لگے، اس واسطے کہ نحو میر یاد نہیں تھی، کسی نے کہہ دیا چوں کہ الف لام لگا ہوا ہے، اسم کی علامت ہے، اسم ہے، آپ نے فرمایا، کون سا اسم ہے؟ ساری نحو میر کا اجراء کرایا، نہ بتانے پر فقط یہ نہیں کہ تنبیہات ہوں۔ ''تنبیہ الغافلین'' ساتھ رہتی تھی اور جہاں غلطی کی وہ آیا، ہم چودہ پندرہ آدمیوں کی جماعت تھی، کوئی بڑی جماعت نہیں تھی، چھوٹی جماعت تھی، ہر وقت ڈر لگا رہتا تھا کہ پڑی، یہ اللہ کا انعام و کرم ہے کہ چودہ آدمی تھے، سب پر برسی، مجھ پر نہ برسی، مجھ پر اللہ تعالیٰ نے کرم کیا تھا، استاذ بھی خوش تھے اور ڈرتا بھی بہت تھا، اس واسطے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے محفوظ رکھا، کبھی مار نہیں پڑی۔ بس عنایتیں رہیں، البتہ کبھی کبھی خفا ہو گئے، تیز نگاہ سے دیکھ لیا، بس یہی میرے لیے مار تھی، مار پڑنے کی نوبت نہیں آئی، سچ کہہ رہا ہوں کہ ہم نے اس طرح پڑھا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ''نفحۃ الیمن'' پڑھنے کے زمانے میں ہم نے عربی نظم کا امتحان دیا، عربی تحریر فقط نہیں، عربی نظم، اشعار اور مفتی کفایت اللہ صاحب جو ادیب بہت اچھے تھے، ان کو ہمارے امتحان کے لیے دہلی سے بلایا گیا تھا، چناں چہ انہوں نے ہمارا امتحان لیا اور ایک مصرعہ دیا کہ اس پر نظم لکھو، تین چار گھنٹے امتحان کا وقت تھا،

ان چار گھنٹوں میں دس شعروں کی ایک نظم لکھ کر پیش کر دی، یہ ''نفحۃ الیمن'' کا زمانہ تھا، آج تو حماسہ پڑھ کر
یہ نہیں کر سکتا۔ وجہ اس کی تعلیم وتربیت کا ایک ڈھنگ تھا، استاذ کا خوف، استاذ کی عظمت ومحبت اور چوا
کی روش یہ تھی، جس پر یہ بات کرنے کی نوبت آئی، وہ مار پیٹ کرتے تھے، اس لیے اتنی محبت ان کی ہمار
میں پیدا ہوگئی تھی، کسی استاذ کی اتنی محبت ہمارے دلوں میں نہیں تھی، جتنی محبت ان کی ہمارے دلوں میں تھی
مجھ پر مار کی نوبت نہیں آئی، البتہ ایک دو دفعہ خفا ہونے کا معاملہ ہوا، بس مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری جان
اس طرح سے استادوں سے پڑھا تھا اور ان سے تعلق رکھا تھا، اس سے کچھ آجایا کرتا تھا، آج کا طالب عل
کہیں، شاگرد کہیں؟ اور مجال ہے استاذ کی شاگرد کو ایک لفظ بھی کہہ دے، اللہ اللہ! کہاں بات چلی گئی؟
پر کہہ رہا تھا کہ انذار کا لفظ اختیار کیا گیا ہے، اصل چیز تبلیغ ہے اور تعلیم کا بھی انجام پھر تبلیغ ہے اور اس
قرآن نے لفظ انذار اختیار کیا، جس پر یہ ساری باتیں ہوئی، ہم دردی وشفقت سے جوڑ رہا تا ہے، اس کا اث
ہوتا ہے، چناں چہ ہمارا تجربہ ہی ہے کہ الحمدللہ اب کوئی دن خالی نہیں جاتا، اتنی عمر ہوگئی کہ اپنے ان استاذ ک
ثواب نہ کرتا ہوں اور مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کو ہمیشہ یاد رکھتا ہوں، انہوں نے مجھ پر شفقت کی اور مار
ہوئی، تنبیہات بھی ہوئیں، ان کی محبت رگ وپے میں سرایت کر گئی۔

## قصور کس کا ہے؟

تجربہ شاہد ہے، لوگ کر کے نہیں دیکھتے، آج بھی الحمدللہ طلبہ میں تنفر نہیں ہے، طلبا کا ج
ہے، استادوں کا بھی، استاد اگر ہم دردی اور محبت سے طلبا کی اصلاح کے لیے یہ چاہیں کہ ہمارے ط
کے اخلاق درست ہو جائیں، ان کی تعلیم ٹھیک ہو جائے، اس پر مار پیٹ بھی کریں، تنبیہات بھی
ممکن ہے کہ ایک آدھ دفعہ کسی کو ناگوار بھی ہو جائے لیکن جب ان کو معلوم ہوگا کہ اس کو کوئی غرض
ہماری محبت میں کرتا ہے تو پھر وہی عاشق ہو جاتے ہیں اور محبت ان کے دل میں سما جاتی ہے افسوس
کہ یہ طریقہ جاتا رہا، کالجوں اور اسکولوں کا سا طرز ہو گیا، مدرس نے پڑھایا، اپنے گھر چلا گیا اور طالب
پڑھا، اپنے حجرہ میں چلا گیا، کسی کو دوسرے سے واسطہ نہیں۔ غرض یہ کہ انذار وہ چیز ہے جس سے ہ
اور شفقت اور بڑھتی ہے، قرآن نے اس کو اختیار کیا: ولینذروا قومھم انذار کرو اپنی قوم کو، ان کو تبل
تبلیغ بھی بشکل انذار، یعنی ہم دردی اور شفقت کے ساتھ، ان کو دین کے مسائل پہنچاؤ۔

## پیغمبرانہ طریق اصلاح اور ہم

کرنے کا کام تو یہ ہے جو قرآن نے بتایا ولینذروا قومھم مقصد زندگی بنانا ہے، اس بات کو کہ یہ امانت اللہ اور اللہ کے رسول کی ہم تک پہنچی ہے، جس کا نام وراثت نبوت ہے: ”العلماء ورثۃ الأنبیا“ علماء انبیا کی وراثت ہیں۔ یہ انبیا کی وراثت آپ کو ملی ہے، یہ امت کو پہنچانی ہے اور پہنچانی بھی شفقت اور ہم دردی کے ساتھ، انذار کے لفظ سے اشارہ کر دیا اس بات کی طرف کہ شفقت و ہم دردی کے ساتھ یہ امت کو پہنچانی ہیں۔ اب ہمارے ہاں تو معاملہ روکھا ہے، انذار کرنے والے کہاں سے لائیں؟ اول تو جیسا میں عرض کر رہا ہوں، ادھر دھیان ہی نہیں ہوتا تبلیغ کی طرف، نہ دوسروں کو سکھانے کی طرف دھیان ہوتا ہے، سینکڑوں میں کوئی ایک ایسا نکلتا ہے جسے دوسروں کی تعلیم وتبلیغ واصلاح کی فکر ہوتی ہے، اس میں ایک اور روک شیطان نے لگا دی، وہ یہ کہ جو انذار کا لفظ قرآن کریم نے اختیار کیا تھا، اس کی طرف دھیان نہیں کرتا، قرآن کی تعلیم کا حاصل انذار کے لفظ سے یہ ہے کہ لوگوں کو پیغمبرانہ تعلیم دو، پیغمبروں کی طرح سے، تشدد کے الفاظ نہ بولو، برا نہ مناؤ، اشتعال نہ پیدا کرو، تمہارا جو مخالف ہے، مخالف عقیدہ رکھتا ہے، مخالف رائے رکھتا ہے، تمہارے خلاف ہے، اس کو دعوت دو قریب کرکے، انذار کے طریقے پر اور انذار اس کا نام ہے کہ شفقت و ہم دردی کے ساتھ یہ بات کہ کسی طرح سے یہ درست ہو جائے، صحیح عقیدہ کو مان لے، اس طرح سے پہنچاؤ، اس کا تو دنیا میں بالکل قحط ہے، سارا قرآن پیغمبروں کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، حضرت ہود علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ قوم نے ان سے کہا: إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ تم کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور جھوٹا بھی سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑی گالی اور کون سی ہوگی، مہذب گالی اس سے بڑی اور کون سی ہوگی کہ تم بے وقوف بھی ہو اور جھوٹ بولنے والے بھی ہو، پیغمبر کیا جواب دیتے ہیں؟ اگر تمہیں کوئی دوسرے فرقہ کا آدمی کہہ دے تو کیا جواب دو گے؟ باپ دادا تک کی خبر لے لو گے، لیکن پیغمبر نے کیا جواب دیا؟ قرآن کے الفاظ دیکھو، وہ تو کہہ رہے ہیں: یَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ میری برادری! ان کو خطاب کرتے ہیں اپنی شرکت کے ساتھ کہ میں تم ہی میں سے ایک ہوں، تم میری برادری ہو اور میرے بھائی ہو۔ اے میری برادری! میں بے وقوف نہیں ہوں، لیکن میں دنیا کے پالنے والے کی طرف سے بھیجا گیا ایک پیغمبر ہوں“ یہ ہے سیدھا سادا جواب، گالی کا جواب، سارا قرآن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

لمحۂ فکریہ

# اس آگ کو بجھائیے!

## مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے تو آبادی کے تمام لوگ آگ بجھانے اور گھر کو بچانے دوڑ پڑتے ہیں اور ہر شخص اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی ایک ساتھ دو بالٹی اٹھاتا ہے، کوئی ڈول دو ڈول لے کر پہنچ جاتا ہے، کوئی لوٹا دو لوٹا ہی پانی ڈال دیتا ہے، چھوٹے بڑے، امیر غریب، جوان بوڑھے اور مرد وعورت... ہر شخص اپنی طاقت اس بلاءِ ناگ گہانی سے بچنے بچانے میں صرف کر دیتا ہے، کیوں کہ اگر آگ پھیلی تو صرف اسی گھر کا نقصان نہیں ہوگا جس گھر میں آگ لگی ہو، بلکہ یکے بعد دیگرے سارے گھر جلیں گے اور پوری بستی خاکستر ہو کر رہ جائے گی، آگ ایسی کور چشم اور عدم نا آشنا ہے کہ اس کی سرشت میں من وتو کا کوئی امتیاز ہی نہیں، نہ امیر کا خیال کرتی ہے، نہ غریب پر رحم کھاتی ہے، نہ طاقت اور حکومت والوں سے ڈرتی ہے نہ بے قصور رعایا اور کم زوروں پر اسے ترس آتا ہے، ایک بلا بے درماں ہے، جو زد میں آتا ہے اسے جلا کر رکھ دیتی ہے۔

اگر دریا پانی سے لبریز ہو اور پشتہ ٹوٹنے کا خطرہ ہو، تو سارے لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ہر شخص اپنی طاقت بھر پشتہ کو مضبوط کرنے اور پانی کو تھامنے کی تدبیر کرتا ہے، کیوں کہ پانی بھی آگ ہی کی طرح بے رحم اور بے حس واقع ہوا ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، خوش رنگ پھلواریاں ہوں، ہرے بھرے کھیت ہوں، پر رونق آبادیاں ہوں، آبادی میں معصوم بچے رہتے ہوں، بے زبان جانور ہوں، بیمار اور بستر مرگ پر پڑے ہوئے لوگ ہوں، اس کی تلاطم خیز موجیں کودتی پھاندتی، دوڑتی بھاگتی، ہر شے کو غرق آب اور تہہ آب کرتی پہنچ جاتی ہیں۔ اس لیے آگ لگ جائے اور سیلاب آجائے تو ایک دوسرے سے برسر پیکار دشمن بھی اپنی عداوتوں کو فراموش کر کے اس مصیبت کا سدِ باب کرنے کے لیے یک جٹ ہو جاتے ہیں۔

یہ آگ اور پانی کی مصیبتیں وہ ہیں جو ہمیں مادی نقصان پہنچاتی ہیں، جن کی وجہ سے ہمارے در و دیوار ویرانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، لیکن ایک اور آگ ہے جس کا نقصان اس نقصان سے بھی بڑھ کر ہے اور ایک

سیلاب ہے جس کی تباہ کاری اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہے، وہ ہے بُرائی اور بے حیائی کی آگ، جو انسانی آبادی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جارہی ہے اور وہ ہے منکرات اور فواحش کا سیلاب، جس کی زد سے کوئی پکا اور کچا مکان محفوظ نہیں ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس آگ اور سیلاب کو بجھانے اور تھامنے کی ہمارے اندر کوئی فکر نہیں، یہ آگ گھر گھر کو سلگا رہی ہے اور یہ سیلاب اخلاق و کردار کی عمارتوں کو زمیں بوس کرتا جارہا ہے، لیکن نہ اس پر بے چین ہونے والے دل ہیں، نہ اس پر رونے والی آنکھیں ہیں، نہ اس کے لیے جنبش میں آنے والے ہاتھ پاؤں ہیں، نہ سماج کے بزرگوں کو اس کی فکر ہے، نہ نوجوانوں میں اس کے مقابلہ کا عزم۔

بُرائی کی طرف میلان انسانی فطرت میں موجود ہے، اس کا مقابلہ اس کے بغیر نہیں کیا جاسکتا کہ جس قوت سے بُرائی پھیل رہی ہے اسی قوت سے، بلکہ اس سے بڑھ کر بُرائی کو روکنے کی تدبیریں کی جائیں، اسی تدبیر کا نام قرآن مجید کی زبان میں ''نھی عن المنکر'' ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ امتِ محمدیہ کا ایک بنیادی مقصد نہی عن المنکر ہے اور اسی فریضہ کی وجہ سے اس کو اقوامِ عالم میں خیر امت یعنی بہترین انسانی گروہ کا لقب دیا گیا ہے۔ (آل عمران)

مسلمانوں کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ''وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اس دوستی کا حق یوں ادا کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کو بھلائی کی دعوت دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں'' (التوبہ) بُرائی سے روکنے والوں کو صالحین میں شمار کیا گیا ہے۔ اور ارشاد ہوا کہ: ''کم سے کم ایک ایسا گروہ ہمیشہ ضرور رہنا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دیتا ہو، بھلائی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو کہ یہی لوگ دراصل کام یاب ہیں۔'' (آلِ عمران)

قرآن کی اس تعبیر پر بھی غور کیجیے کہ بھلائی کو معروف اور برائی کو منکر سے تعبیر کیا گیا ہے، معروف کے اصل معنی ایسی بات کے ہیں جو لوگوں میں مروج اور مشہور ہو اور جس کا چلن قائم ہو گیا ہو، اس کے مقابلہ میں منکر کا لفظ ہے، یعنی ایسی بات جو ان پہچانی اور نامانوس ہو، گاہے گاہے پیش آجاتی ہو، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سماج میں نیکیوں کا عام چلن ہونا چاہیے، وہ سماج کا مروج اور مشہور عمل ہو اور برائی کو سماج میں اتنا کم ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کے لیے اچنبھے کا باعث ہو، خلافِ معمول کبھی یہ بات پیش آجاتی ہو۔

اس تعبیر سے نہی عن المنکر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب بُرائی کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ (مسلم

شریف ) منکر سے روکنے کے مطلب دو ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ دل سے اس پر کراہت محسوس کرے، دوسرے یہ کہ دل میں اس بات کا عزم رکھے کہ جب اسے قدرت حاصل ہوگی وہ اس برائی کو روکنے کی کوشش کرے گا، ہاتھ سے روکنے کا منشا مار پیٹ اور جنگ وجدال ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے اثر ورسوخ اور اخلاقی دباؤ کا استعمال کرنا بھی اس میں داخل ہے، جیسے انسان دنیا کے مسائل میں اپنے رُسوخ اور اپنی حیثیت کو کام میں لاتا ہے، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے بارے میں اسے اس سے بڑھ کر اپنی اخلاقی قوت استعمال کرنا چاہیے۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ جن چیزوں کا برائی اور منکر ہونا متفق علیہ ہے اور جن کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں، ان میں بھی عوام تو کیا، اہلِ علم اور اہلِ دین بھی کھلے تساہل سے کام لیتے ہیں، اس سے کس کو اختلاف ہوگا کہ گانا بجانا حرام ہے، شادی بیاہ میں مروجہ تصویر کشی اور ویڈیو گرافی جس میں عورتوں کی بھی تصویریں محفوظ کرلی جاتی ہیں، ناجائز ہیں، اس سے کسے اختلاف ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے بے جا مطالبات حرام ہیں اور رشوت کے حکم میں ہیں، کون نہیں جانتا کہ سودی کاروبار پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت ہے، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سماج کے بااثر لوگ جب علانیہ ان برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی جھوٹی شان بھگارتے ہیں، تو نہ صرف یہ کہ ہماری زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں، بلکہ ہم خود ان تقریبات میں شریک ہو کر رونق محفل میں اضافہ کرتے ہیں، ہم خود حرام اور ناجائز کاروبار کرنے والوں کی اہتمام اور احتشام سے معمور دعوتوں میں شریک ہو کر عملاً اس برائی کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

حدیث میں اسی لیے برائی سے روکنے کو زبان کا جہاد (جہاد باللسان) قرار دیا گیا ہے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۹) کیوں کہ نیکی کی دعوت آسان ہے، اگر آپ کسی کو نماز روزہ کی دعوت دیں، حج وزکوۃ کے لیے توجہ دلائیں تو اس سے اس کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آتی، نہ اس سے اس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے، لیکن جب کسی انسان کو اس کی برائی پر ٹوکا جائے تو اس سے اس کی انا مجروح ہوتی ہے، وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بجائے وہ بے جا ردعمل کا اظہار کرتا ہے، اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بہت بڑا گناہ (اکبر الذنب) ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ تم اللہ سے ڈرو، تو وہ جواب میں کہے: تم اپنی فکر کرو، علیک نفسک (مجمع الزوائد ۷/۲۷۱)

جو چیز برائی پر ٹوکنے اور اس سے روکنے میں رکاوٹ بنتی ہے، وہ بنیادی طور پر دو ہیں، ایک دنیا کی محبت،

دوسرے اہل ثروت اوراہل اقتدار کا خوف، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جب تم میں دنیا کی محبت گھر کر لے گی تو تم نہ نیکی کا حکم دوگے اور نہ برائی سے روکو گے اور نہ اللہ کے راستہ میں جہاد کروگے۔(مجمع الزوائد ۷/۲۷۱)او رحضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اورارشاد فرمایا : خبردار! کسی شخص کولوگوں کی ہیبت حق جاننے کے باوجود، حق کہنے سے باز نہ رکھے۔(ترمذی، حدیث نمبر ۴۰۰۸) یہ اس امت کے ادباراور پستی کی علامت ہے کہ اس میں برائی پر ٹو کنے والی زبانیں باقی نہ رہیں، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس دین کے اقبال کی علامت یہ ہے کہ تمام مسلمانوں میں دین کا فہم ہو، اس میں ایک دو برے لوگ ہوں تو وہ سماج میں ذلیل سمجھے جائیں اوراس دین کے ادبار کی علامت یہ ہے کہ عام لوگ گناہ میں مبتلا ہو جائیں، اکادکا اشخاص دین پر قائم ہوں، وہ سماج میں ذلیل سمجھے جائیں اور بات کریں تو مطعون ٹھہریں، یہاں تک کہ علانیہ شراب پی جائے ،ایک عورت قوم پر سے گزرے،قوم میں سے ایک شخص اس کی طرف کھڑا ہواور دامن اٹھا کراس طرح برائی کرے جیسے کسی مادہ جانور کی دم اٹھا کر نراس سے جفتی کرتا ہے،اس دن جو شخص یہ کہے کہ تم نے اس کواس دیوار کے پیچھے تو کرلیا ہوتا،تو وہ اس دن اس میں ویسے ہی ہوگا جیسے تم میں ابوبکر وعمر، اس دن جو نیکی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے، اس کے لیے ایسے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہوگا جس نے مجھے دیکھا ہو،میری اطاعت کی، مجھ پر ایمان لایا ہو اور میرے ہاتھوں پر بیعت ہوا ہو۔(مجمع الزوائد ۷/۲۶۷) برائی کے سیلاب کو دیکھتے ہوئے خیال گزرتا ہے کہ شاید اب وہ وقت قریب آ گیا ہے۔

برائی سے نہ روکنے کا گناہ صرف آخرت سے متعلق نہیں ہے، بلکہ دنیا سے بھی متعلق ہے،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور ظلم سے نہ روکیں،تو اللہ تعالیٰ کا عذاب سبھوں کو پکڑ لے گا اور جس قوم میں گناہ کیا جاتا ہے، کچھ لوگ اس سے دور کرنے پر قادر ہوں، پھر بھی وہ اسے دور نہ کریں،تو قریب ہے کہ اللہ کا عذاب ان سب کو اپنی پکڑ میں لے لے۔(ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۳۳۸،ترمذی، حدیث نمبر ۲۱۶۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے قریب ایک لشکر کے زمین میں دھنسا دیے جانے کا ذکر کیا،حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا : شاید ان میں ایسے لوگ بھی ہوں جنھیں زبردستی لایا گیا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کے عذاب میں تو سب شامل ہوں گے، آخرت میں نیتوں کے اعتبار سے معاملہ ہوگا۔(ترمذی،حدیث نمبر ۲۱۷۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : بنی اسرائیل میں اس طرح بُرائی کا آغاز ہوا کہ ایک شخص دوسرے کو اس برائی پر ٹوکتا اور کہتا کہ یہ حلال نہیں اور کل ہو کر اسی کا ہم نوالہ، ہم پیالہ اور ہم نشیں بن جاتا، چناں چہ یہی چیزیں بنی اسرائیل پر عذاب الٰہی آنے کا باعث ہوئیں۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۳۳۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کے گناہ کی وجہ سے پوری قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے، بلکہ جب کچھ لوگ گناہ کرتے ہیں اور اکثریت قدرت کے باوجود اس پر خاموشی اختیار کرتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عوام وخواص سبھوں کی ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ **فذاک حین یاذن اللہ فی ھلاک العامۃ و الخاصۃ** (مجمع الزوائد ۷/ ۲۶۸)

یہ ضروری ہے کہ سماج کا ضمیر زندہ ہو، وہ بُرائی سے ایسی ہی نفرت کرتا ہو جیسے انسان گندگی سے نفرت کرتا ہے، سماج میں جب کوئی بُرائی ہو تو کتنی زبانیں ہوں جو اس پر ٹوکنے کے لیے آمادہ ہوں، جب ایک ہاتھ ظلم کرے تو سینکڑوں ہاتھ اس ظلم کو روکنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں، جب کوئی نگاہ بُرائی کرے تو کتنی ہی غضب آلود نگاہیں اس کا حوصلہ پست کر دیں، خدا کی نافرمانی پر انسان کو اپنی نافرمانی سے زیادہ طیش آئے، اپنے بھائی پر جب کوئی ظلم ہوتا ہوا دیکھے تو اسے محسوس ہو کہ یہ ظلم خاص اس پر ہو رہا ہے، جب وہ کسی آبرو کو لٹتے ہوئے دیکھے تو اسے خیال ہو کہ یہ عزت وآبرو کی مقتول عورت اس کی بہن یا بیٹی ہے، برائیوں کے بارے میں جب تک ضمیر زندہ نہ ہو، حدود اللہ کی اہمیت انسان کے ذہن میں نہ ہو اور خدا کے خوف سے ہمارے سینے معمور نہ ہوں اس وقت تک برائیوں کے اس سیلاب کو تھامنا، بے حیائی کی اس آگ کو بجھانا اور بداخلاقی کی اس تیز آندھی کو روکنا ممکن نہ ہوگا۔

---

طابع وناشر وایڈیٹر (مولانا) محمد عاقل (صاحب) ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور
نے سبھاش پرنٹنگ پریس سہارنپور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور سے شائع کیا

# منگنی کی حقیقت، حکم اور اَحکام

مفتی محمد راشد ڈَسکوی عفا اللہ عنہ
دار الافتاء جامع مسجد اشتیاق، ڈسکہ

## منگنی کی حیثیت اور مقصد

منگنی کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ دونوں خاندانوں کے کچھ افراد جمع ہو کر آپس میں رشتہ نکاح کی بات پکی کر لیں، اور اس حد تک شَرعی طور پر اِس میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ بالکل جائز ہے، قرآن پاک میں بھی رشتہ نکاح قائم کرنے کے لیے پیغام دینے کا اشارہ موجود ہے،

{قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ}، [القصص :۲۷]

”اور حضرت شعیب علیہ السلام نے (حضرت موسیٰ علیہ السلام سے) فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تم سے کر دوں“۔

اور خود جناب نبی اکرم ﷺ سے بھی ثابت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو شادی کا پیغام دیا تھا۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث ۴۷۹۳)

اس کے علاوہ اور ازواج مطہرات کی طرف پیغام بھیجنے کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ! اس کی حیثیت محض وعدہ نکاح کی ہوتی ہے، یعنی: منگنی کا مقصد مستقبل میں ہونے والے نکاح کے عقد کو پختہ کرنا ہوتا ہے، یہ بذاتِ خود نکاح نہیں ہے اور نہ نکاح کے لیے کوئی واجبی عمل ہے، منگنی کے بغیر بھی نکاح ہو سکتا ہے، اس کو ضروری سمجھنا بھی غلط ہے۔

چنانچہ منگنی کا عمل اگر رسومات وخرافات سے پاک ہو، اور اس میں کسی ناجائز اور حرام امر کا ارتکاب نہ ہو تو منگنی کرنے میں مضائقہ نہیں، جائز ہے۔ کبھی کبھار اس مجلس میں نکاح کے بعض ضروری امور مثلاً: مہر وغیرہ بھی طے کر لیے جاتے ہیں، اس سے ہٹ کر منگنی کے لیے شریعت نے کوئی مخصوص طریقہ مقرر نہیں کیا۔

## منگیتر سے بات چیت کرنے کا حکم

منگنی نکاح کا وعدہ ہے، نکاح نہیں ہے، منگنی کرنے کے بعد منگیتر بھی دیگر اجنبی لڑکیوں کی طرح نامحرم ہی ہوتی ہے، اور نامحرم لڑکیوں سے تعلقات رکھنا، ملنا جلنا، اور ہنسی مذاق یا بغیر ضرورت بات چیت کرنا جائز نہیں ہے، اور میسج پر تعلقات رکھنے کا بھی یہی حکم ہے، نیز ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ منگنی ایک طویل زمانہ تک چلتی رہتی ہے، اور لڑکا و لڑکی منگنی کے بعد ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی قباحت بھی محسوس نہیں کرتے، بلکہ ان کے خاندان والے بھی اس کو عار نہیں سمجھتے، حالاں کہ شرعاً یہ بالکل ناجائز اور غیر مسلموں کا طریقہ ہے۔ آج کل کے حالات میں جنسی فتنوں سے بچنے کے لیے بہتر اور سمجھ داری کی بات یہ ہے کہ منگنی کے بعد نکاح اور رخصتی میں تاخیر نہ کی جائے۔

نوجوان بھائیوں سے گذارش ہے کہ چونکہ کسی بھی غیر محرم لڑکی سے بلاضرورت بات چیت کی اجازت نہیں ہے، اس لیے اگر غیر محرم لڑکی سے بات کرنے کا دل چاہتا ہے تو اس پر صبر کرنا ایمان کا تقاضا ہے، اور اس میں ہی اجر وثواب اور فضائل ہیں، لہٰذا جب ایسی خواہش پیدا ہو، اس یقین کے ساتھ اپنی خواہشِ نفس کو دبائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، اور میں صبر کروں گا تو وہ اس پر بے پناہ اجر دیں گے۔

## منگیتر کو تحفے وتحائف بھیجنے کا حکم

پردہ وغیرہ احکام کی رعایت رکھتے ہوئے خاندان کے بڑوں کے ذریعے اپنی منگیتر کو تحائف بھجوانے کی گنجائش ہے۔ البتہ! منگیتر سے ازخود ایسے مراسم قائم نہ کیے جائیں۔

## منگیتر کو دئیے جانے والے زیورات وغیرہ کس کی ملکیت ہوں گے؟

لڑکی کو منگنی یا نکاح کے موقع پر جو زیورات یا انگوٹھی وغیرہ سسرال والوں کی طرف سے ملتے ہیں، ان میں یہ تفصیل ہے کہ

اگر زیورات دیتے وقت سسرال والوں نے اس بات کی صراحت کی تھی کہ یہ بطورِ عاریت یعنی: صرف استعمال کرنے کے لیے ہیں تو پھر یہ زیورات لڑکے والوں کی ملکیت ہی رہیں گے۔

اور اگر سسرال والوں نے ہبہ، گفٹ اور مالک بنا کر دینے کی صراحت کر دی تھی تو پھر ان زیورات کی مالک لڑکی ہوگی۔

اور اگر زیورات دیتے وقت کسی قسم کی صراحت نہیں کی تھی تو پھر لڑکے کے خاندان کے عرف کا اعتبار ہوگا، اگر ان کا عرف ورواج بطورِ ملک دینے کا ہے یا ان کا کوئی رواج نہیں ہے تو ان دونوں صورتوں میں زیورات کی مالک لڑکی ہوگی، اور اگر بطورِ عاریت دینے کا رواج ہے تو پھر سسرال والے ہی مالک ہوں گے۔

لڑکی کے مالک بن جانے کی صورت میں بھی اگر سسرال یا لڑکے والے واپس لینا چاہیں تو یہ بری بات ہے کہ ہدیہ کسی کو دے کر واپس لیا جائے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''الْعَائِدُ فِي هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَعُودُ فِي قَيْئِهِ، لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ'' اپنی ہبہ گفٹ کی ہوئی چیز کو واپس لینے والا اُس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے پھر اُسے کھا لیتا ہے، ہم مسلمانوں کی شان بری مثالوں کو اپنانا نہیں۔'' (صحیح البخاری، رقم الحدیث ۶۵۷۴)

اسی تفصیل کو مدنظر رکھتے ہوئے ان زیورات کی وجہ سے زکوٰۃ اور قربانی کا حکم کہ کس پر لازم ہوں گے، سامنے آجاتا ہے کہ جو ان کا مالک ہوگا، وہ انہیں اپنے نصاب میں داخل کرے گا۔

دوسری بات یہ کہ ملکیت کس کی ہوگی اور کس کی نہیں، اس کو واضح کرنے کے لیے اوپر ذکر کردہ صورتوں میں سے کوئی ایک متعین کرتے ہوئے دوسرے کے سامنے واضح کر دینی چاہیے تاکہ معاملات واضح رہیں۔

## پہلے سے منگنی شدہ لڑکی سے منگنی کی کوشش کرنا

ایسی لڑکی جو کنواری ہو، ابھی اس کا کہیں رشتہ طے ہوا ہو، یا ابھی تک کہیں طے نہ ہوا ہو تو اسے رشتہ کا پیغام بھیجنے کی مختلف صورتیں ہیں، ملاحظہ ہو:

۱- اس کے رشتہ کی بات نہ چلی ہو، یا کسی اور جگہ چلی ہو اور اُس لڑکی نے اُسے رد کر دیا ہو، اس صورت میں اُس کی طرف رشتہ بھیجنا جائز ہے۔

۲- اس کے رشتہ کی بات چل رہی ہو، اور جہاں بات چل رہی ہو، لڑکی والوں کی طرف سے اُس لڑکے کے ساتھ رشتے پر آمادگی ظاہر نہ کی گئی ہو، تو اِس صورت میں اُس کی طرف رشتہ بھیجنا بلا کراہت جائز ہے۔

۳- اس کے رشتہ کی بات چل رہی ہو، اور جہاں بات چل رہی ہو، لڑکی والوں کی طرف سے اُس لڑکے کے ساتھ رشتے پر آمادگی، یا قلبی میلان کا اظہار ہو چکا ہو تو اِس صورت میں اُس لڑکی کی طرف رشتہ بھیجنا مکروہ ہے۔

۴- اس کے رشتہ کی بات کسی اور جگہ چلی ہو، اور اُس لڑکی والوں نے رشتہ بھیجنے والے کے

ساتھ رشتہ کرنے کا اقرار کرلیا ہو، (جس کو منگنی کہتے ہیں)، تو اِس صورت میں اُسے رشتہ بھیجنا ناجائز ہے۔

## لڑکی/لڑکے کو انگوٹھی پہنانا

رسم منگنی کا انتہائی بدترین عمل بہت سارے علاقوں میں بالخصوص امراء کے ہاں یہ ہوتا ہے کہ لڑکا اپنی منگیتر کا ہاتھ تھام کر اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے سامنے اُسے سونے کی انگوٹھی پہناتا ہے یونہی لڑکی بھی سونے کی انگوٹھی (جوکہ مرد کیلئے حرام ہے۔) منگیتر کو اپنے ہاتھ سے پہناتی ہے، جسے بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا، حالانکہ وہ لڑکا اپنی منگیتر کیلئے منگنی سے پہلے بھی اور منگنی کے بعد بھی اجنبی اور غیر مَحرم ہی ہوتا ہے لہٰذا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہنانا تو دُور کی بات اُسے چھونا بھی سراسر ناجائز ہے۔

بعض لوگوں کا ذہن اور خیال ہے کہ ان انگوٹھیوں سے لڑکی اور لڑکے کے مابین محبت بڑھتی ہے اور خاوند اور بیوی کے تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے، ایسا اعتقاد رکھنا جاہلی اعتقاد ہے اور وہ تعلق ہے جس کی نہ تو کوئی حسی اور نہ ہی شرعی اصل اور دلیل ملتی ہے۔

انگوٹھی پہنانے کی اس رسم میں غیر مسلم یہود ونصاریٰ اور ہندوؤں وغیرہ سے مشابہت ہے، یہ اسلامی معاشرے کے کسی بھی دور میں مسلمانوں کی عادات میں شامل نہیں رہی اور نہ ہی ہے، اور نبی اکرم ﷺ نے ہمیں غیر مسلمین کی مشابہت اختیار کرنے سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

یہ ایک ایسی رسم ہے کہ منگنی کو گویا کہ اس رسم کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا ہے، اس لیے بھی یہ قابل ترک ہے، کہ غیر لازم چیز کو لازم کرنا اسے غیر شرعی ہونے کی طرف لے جاتا ہے، البتہ اگر اسے لازم سمجھے بغیر دکھلاوے اور ریا کاری سے بچتے ہوئے اس طرح کرلیا جائے کہ لڑکی اور لڑکے کے والدین اپنے بچی اور بچے کے لیے ایک دوسرے کو لڑکی اور لڑکے کے لیے سونے کی یا چاندی کی انگوٹھی بطور ملکیت دے دیں، جسے وہ بطور قیمتی مال محفوظ رکھیں، لینا جائز ہے لیکن لڑکا سونے کی انگوٹھی کو پہن نہیں سکتا۔ البتہ چاندی کی انگوٹھی پہن سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا وزن ساڑھے چار ماشے سے کم ہو، اس سے زیادہ نہیں۔

## منگنی توڑنے کا حکم

اوپر بہت تفصیل سے یہ بات ذکر کی جاچکی ہے کہ منگنی کی حیثیت محض وعدہ نکاح کی ہوتی ہے، اور شریعت کا حکم وعدہ کے سلسلے میں یہ ہے کہ حتی الوسع اسے پورا کیا جائے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ:.''اے ایمان والو! (اپنے) عہد پورے کرو۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے: وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولاً ''اور تم اپنے وعدوں کو پورا کرو، بیشک وعدہ کی ضرور پوچھ گچھ ہوگی''۔

تاہم شدید مجبوری کی صورت میں اس کے خلاف کرنے کی بھی گنجائش ہوتی ہے، مثلاً: قرائن قویہ سے معلوم ہوجائے کہ لڑکا نامرد ہے، تو یہ ایسا عذر ہے جس کی وجہ سے دلائل شرعیہ کی روشنی میں فقہاء کرام نے شادی کے بعد بھی عورت کو فرقت حاصل کرنے کا اختیار دیا ہے، لہٰذا منگنی (جو کہ محض وعدۂ نکاح ہے) کی صورت میں شوہر کے نامرد ہونے کی وجہ سے منگنی توڑ دینا بدرجہ اولیٰ جائز ہے، البتہ اگر مرد کی یہ کمزوری معلوم ہونے کے باوجود اگر کسی عورت نے مذکورہ شخص سے نکاح کرلیا، تو نکاح کے بعد رضامندی کا اظہار کرنے والی اس عورت کو اس عذر کی بنا پر عدالتی فسخِ نکاح کا حق حاصل نہ ہوگا۔

لہٰذا ایسی کسی شدید شرعی مجبوری کی وجہ سے منگنی ختم کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن ایسی صورت میں بھی کسی مناسب طریقے سے منگنی توڑنی چاہیے، شدید عذر کے بغیر منگنی ختم کرنا باعثِ گناہ ہے، نیز! لڑکے اور لڑکی کی اجازت کے بغیر گھر والوں کا منگنی ختم کرنا درست نہیں ہے۔ منگنی ختم کرنے کے لیے طلاق وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنا ضروری نہیں ہوتا، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ہم نے منگنی ختم کردی ہے۔

علاوہ ازیں! ایسی مجالس میں نمازوں کا ضیاع، مرد وعورت کا اختلاط، عورتوں کا بے حجابانہ وہاں شریک ہونا، ویڈیو اور تصاویر کے سیشن، ڈانس پارٹی اور موسیقی وغیرہ کا استعمال بہر صورت جائز نہیں ہے۔

☆☆☆......☆☆......☆☆☆

## دنیا کی قباحت:

کعب ابن عیاض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے: کہ ہر امت کے لیے کوئی خاص آزمائش ہوتی ہے اور میری امت کی خاص آزمائش مال ہے (ان لکل امة فتنة و فتنة امتی المال) (رواہ الترمذی)

لائقِ عمل

# خیر امت کی خیرت کے اسباب

## مولانا شفیق احمد قاسمی ابوظہبی

اللہ تعالی کی اس کائنات حقیقی پر ایک لاکھ سے زائد انبیاء اور رسول تشریف لائے جن کا منصبی فریضہ اپنی اپنی قوم کو ضلالت و جہالت اور تمرد و سرکشی کی زندگی سے نکال کر اپنے پالنہار کی اطاعت و عبادت پر لگانا تھا اور سب سے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسک الختام بنا کر بھیجے گئے، آپ کی بعثت و رسالت پر اللہ رب العالمین نے نبوت و رسالت کے روحانی و ایمانی سلسلہ کو تمام کر دیا، آپ کسی قوم خاص اور زمانہ خاص کے لئے نہیں بلکہ سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے، **وما ارسلنک الا رحمة للعالمین۔**

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء پر چھ باتوں میں فضیلت حاصل ہے:
(۱) مجھے جوامع الکلم عطا کیا گیا (۲) رعب سے نواز کر میری مدد کی گئی (آپ کے رعب و دبدبہ کا اثر دور ہی سے لوگوں پر ظاہر ہونے لگتا تھا) (۳) میرے لئے مال غنیمت (جو پہلی امتوں پر حرام تھا) حلال کر دیا گیا (۴) میرے لئے تمام زمین کو سجدہ گاہ اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا (جو پہلی امتوں کے لئے عام نہیں تھا بلکہ خاص عبادت گاہ میں جا کر ادا کرنا لازم تھا) (۵) مجھے تمام لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا (۶) میری نبوت پر نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ (رواہ مسلم)

جس طرح تمام نبیوں اور رسولوں پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تفوق و امتیاز حاصل ہے آپ کی برکت سے آپ کی امت کو بھی گذشتہ تمام نبیوں کی قوموں اور امتوں پر خصوصیت حاصل ہے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں تو آپ کی امت مسلمہ خیر امم کا تمغۂ امتیاز رکھتی ہے، اللہ تعالی نے کسی بھی قوم کو یہ اعزاز نہیں عطا کیا کہ اس کو سب سے بہترین اور افضل امت کہہ کر مخاطب کیا گیا ہو، لیکن امت محمدیہ کو خیر امت کہہ کر مخاطب فرمایا اور اس کی خیریت کے اسباب و ابواب بھی بتا دیئے کچھ تو آیت کریمہ کے ذریعہ کچھ اپنے رسولِ کامل کے واسطہ سے، ارشاد خداوندی ہے: **کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون**

بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله۔

تم سب سے بہترین امت ہو جس کو لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے وجود میں لایا گیا ہے تم لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے اور منکرات سے منع کرتے ہو اور خود بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

للناس میں لام عربی قاعدہ کی رو سے افادہ کے لئے ہے یعنی لوگوں کو ہر اعتبار سے فائدہ پہنچانا تمہاری خیریت وعافیت اور عزت ووقعت کا ایک بڑا سبب ہے اور فائدہ کی روح یہ ہے کہ ان کو وہ چیزیں بتاؤ جن کو اختیار کر کے وہ دنیا اور آخرت کی فلاح وبہبود حاصل کر سکیں اور ان ناپسندیدہ باتوں سے روکو جن کے کرنے میں دنیاوی نقصان بھی ہیں اور آخرت کا دائمی خسارہ بھی، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمانوں کی تاحیات باقی رہنے والی ذمہ داری ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ کسی قوم کو یہ اہم ذمہ داری نہیں سونپی گئی جو لازمی ہو بلکہ علماء یہود کو حکم تھا کہ اپنی قوم کی اصلاح کرتے رہیں برائی سے روکیں اور بھلائی کی تلقین کریں لیکن ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد نہیں تھی جب کہ امت محمدیہ کے ہر ہر فرد پر اس کی صلاحیت، حیثیت اور مرتبہ کے اعتبار سے کسی نہ کسی زاویہ سے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اپنے متعلقین، عامۃ المسلمین اور ماتحتوں کو اچھے برے کی تمیز سکھائے ان کے اچھے کاموں کی تعریف کر کے حوصلہ بڑھائے، اور برے کاموں پر نکیر کر کے ارتکاب معاصی سے بچائے، ضرورت پڑے تو غلط کاموں پر سرزنش کرے اگر یہ سب کام نہیں کیا صرف اپنی ذات تک اچھے کاموں کو محدود رکھا یا تنہا برائیوں سے بچتا رہا دوسروں کو برائی کرتے دیکھ کر روکنے کی قدرت رکھتے ہوئے بھی مصلحت یا نفع وضرر کی وجہ سے خاموش رہا تو اللہ کے یہاں بڑے مؤاخذہ سے نہیں بچ سکتا، رسول کریم صلوات اللہ علیہ وسلامہ نے فرمایا : كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته (بخاری ومسلم) کہ تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت (مراد آل واولاد، خدام وماتحت افراد ہیں) کا نگراں ہے اور ان کی برائیوں، خطاؤں، گناہوں کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے گا کہ تمہارے رہتے ہوئے انہوں نے یہ حرکات کیسے کیں تب کیا جواب ہوگا؟؟

اسلام میں اکثر امور سماج ومعاشرہ سے جڑے ہوئے ہیں صالح معاشرہ کی تشکیل: اسلام کی تعلیمات میں سے کہ ہر فرد خواہ باپ ہو یا ماں، شوہر ہو یا بیوی، اولاد ہوں کہ رشتہ دار واقارب اور دوست واحباب صدفیصد اللہ کی مرضیات پر عمل کرنے والے ہوں گے تب ایک پاکیزہ اور صالح، اللہ سے خوف کھانے والا اور آخرت کی فکر کرنے والا سماج وجود

میں آئے گا اور صالح معاشرہ کی تشکیل میں سب سے مؤثر وبلیغ عمل ہر فرد ایک دوسرے کی خیر خواہی کرے آپس میں تعاون کریں نیک اور بھلے کاموں میں باہم معاون ہوں اور برائیوں گناہوں میں کبھی کسی کی مدد نہ کریں۔

وہ کون سا انسان ہوگا جو عقل وشعور رکھتے ہوئے بھی خود کو ہلاکت و بربادی میں ڈالے گا اپنے لئے دنیا و آخرت کے نقصان کا سودا کرے گا، لہٰذا اسلام کہتا ہے کہ تمہاری خیریت کا ایک اہم باب یہ بھی ہے کہ جو چیز تم اپنی اصلاح وفلاح کے لئے اپنے واسطے چاہتے ہو تو کہ اس کی ذات تمہارے لئے مضر اور نقصان دہ نہ ہو اس کی ہمسائیگی تمہارے لئے گھر والوں کے حق میں زحمت نہیں رحمت ہو، تو تم خود بھی اس کے لئے رحمت وسلامتی اور بھلائی بن کر دکھاؤ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لایؤمن أحدکم حتی یحب لأخیہ مایحب لنفسہ** (بخاری ومسلم) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں کا کوئی مؤمن (کامل) نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہی چیز اپنے بھائی کے لئے نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور معاذ بن جبل کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: افضل ایمان یہ ہے کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور اس کے لئے وہ چیز خراب جانو جو تم اپنے لئے خراب جانتے ہو (اور بچتے ہو) (مسند احمد)

انہیں اعمال میں مسلمانوں کی دنیوی اور اخروی خیریت پوشیدہ ہے یہی کارہائے خیریت مسلمانوں میں وحدت و مساوات کی روح پیدا کرتے ہیں، انہیں افعال سے مسلمانوں میں محبت وبھائی چارہ کی فضا قائم ہوتی ہے۔

اسلام کے اصول معاشرت اور ضوابط تعلقات سے ہٹ کر جب بھی مسلمانوں نے اپنے لئے عظمت و شرافت اور خیریت وعافیت کا گوشہ تلاش کرنے کی سعی ناکام کی ہے تو انتشار وتنازعات کی تاریکی مقدر بنی ہے، ہم مسلمانان عالم تمام تر وسائل کے باوجود خیریت سے آج دور ہیں، ظاہری چمک دمک، مصنوعی زندگی اور خدا فراموشی کی روش سے اگر ظاہری دولت وثروت اور مادی اسباب و ذرائع ہمارے پاس جمع ہوگئے ہیں، لیکن گھروں میں ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی دوریاں ہیں، باپ کے قابو میں بیٹا نہیں، ماں کے بس میں بیٹی نہیں، شوہر اور بیوی میں ذہنی مناسبت اور دلی محبت نہیں، پڑوسیوں اور ہمسایوں سے اخوت ومحبت کے تعلقات مفقود ہیں، رشتہ داروں اور قرابتداروں سے ناچاقی ہے، کیونکہ اپنی اور امت کی خیر خواہی کے جملہ اسلامی ابواب کو ہم نے اپنے اوپر بند کرلیا ہے صرف اپنے مفاد کی فکر میں لگے ہیں دوسرے جائیں جہنم میں یہ نظریہ بنالیا گیا ہے۔

ہم ایک دوسرے سے اس قدر بیگانہ اور مطلب پرست بن چکے ہیں کہ بغیر اپنے ذاتی مفاد کے محض اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دینی بھائی کی خیر خواہی میں کچھ سوچنے اور کرنے پر آمادہ نہیں حالانکہ ہم کو اسلام ایثار پسند بننے کی تعلیم دیتا ہے کہ اپنے نفع پر دوسرے دینی بھائی کے نفع کو ترجیح دینے کا مزاج بناؤ، استیثار کے بجائے ایثار کرو، دوسروں کو فائدہ پہنچاؤ، ایثار کا درس دنیا کی تمام مخلوقات سے ہم کو ملتا ہے درختوں کو دیکھیں، طرح طرح کے پھل دیتے ہیں لیکن کوئی درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتا، دوسرے کھاتے ہیں، گائے بھینس، بکری طاقت وقوت سے بھرپور دودھ دیتے ہیں لیکن وہ اپنا دودھ نہیں پیتے بلکہ ہمارے جیسے انسان پیتے ہیں، پھول خوشبو دوسروں کے لئے پھیلاتے ہیں، دریا وآبشار دوسروں کے باغات اور کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں یہ صرف انسان کا وصف ہے کہ اپنی کمائی خود کھاتا ہے اور حریص اتنا کہ دوسروں کی کمائی کھانے پر بھی نہ صرف ہمہ دم آمادہ رہتا ہے بلکہ باطل طریقوں سے لوٹ کھسوٹ کر کھاتا ہے، سازشیں کرتا ہے ڈاکہ ڈالتا ہے تاکہ اپنا پیٹ اور اپنا گھر بھرے جب کہ قرآن اس کو وارننگ دیتا ہے ''**لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل**'' کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے مت کھاؤ۔

کیا بلند شان تھی خیر امت کی جب کہ وہ صرف اللہ اور رسول کی مرضیات پر چلتے تھے اور اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے اللہ کے لئے جیتے مرتے اور محبت ونفرت کرتے تھے یا اللہ کے لئے ہی کسی کو کچھ دیتے تھے اگر نہیں دیتے تھے تو اس میں بھی اللہ کی خوشنودی مقصود ہوتی تھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو ہی کامل الایمان فرمایا ہے جن میں ہر اعتبار سے خیریت ہی خیریت تھی دنیا کی عظمت ورفعت حاصل تھی اور آخرت کی مغفرت وجنت تھی، فرمایا رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ''**من أحب لله و ابغض لله و اعطی لله و منع لله فقد استکمل الایمان**'' (رواہ ابوداؤد) جس نے اللہ کے لئے محبت کی اور اسی کے لئے بغض رکھا اسی کے لئے کسی کو دیا اور اسی کے لئے نہیں تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل کرلیا اور یہی کمال ایمان اور کمال بندگی مسلمانوں کی خیریت ہے، باقی سب ذلت کے اسباب اور ابواب ہیں جو ہم مسلمانوں نے اسلام سے دور ہو کر اپنے لئے کھول لئے ہیں۔

علمی تحقیق

گذشتہ سے پیوستہ

# قرآن کریم کے سات حروف

## مراداور مفہوم

مولانا محمد معاویہ سعدی

استاذ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

[ گذشتہ مجلس میں ''قرآن کے سات حروف'' سے متعلق جو سلسلۂ بحث شروع کیا گیا تھا اسی سے متعلق ایک طالب علم نے حضرت قاری ابوالحسن صاحب اعظمی زیدمجدہم کے ''علمِ قراءت اور قراء سبعہ'' نامی ایک رسالہ کی طرف رہنمائی کی، وہ رسالہ دیکھا تو واقعی اس کے مقدمہ میں اس موضوع پر نہایت محققانہ اور بصیرت افروز کلام کیا گیا ہے، اِس لیے پیشِ نظر مضمون میں اس سے بھی کافی استفادہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ تمام اکابر اور علماء ومشایخ کو ہم سب کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے، اور ان کے علوم ومعارف سے ہم سب کو مستفید فرمائے، آمین ]

اِس پر تو علماء کا اتفاق ہے کہ یہاں ''سبعۃ أحرف'' میں ہر ہر حرف کو سات طرح سے پڑھنا مراد نہیں ہے، بلکہ بحیثیتِ مجموعی سات طرح کے اِختلافات مراد ہیں، البتہ اُن اختلافات کی نوعیت کیا ہے؟ اِس میں علماء کے درمیان شدید اِختلاف ہے، ان میں سے چند مشہور اقوال یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ بعض حضرات نے مسئلہ سے متعلق مختلف اقوال کو دیکھ کر، اس کو لاینحل سمجھ لیا، اور حدیثِ مذکور کو ''متشابہات'' میں سے قرار دے دیا، یہ قول محمد بن سعدان نحویؒ کا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ لفظِ ''حرف'' (کلمہ، معنیٰ، جہت اور حرفِ ہجاء وغیرہ) متعدد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہاں کسی ایک معنیٰ کی تعیین مشکل ہے، اِس لیے یہ حدیث متشابہات میں سے ہے۔ (البرہان للزرکشی ۱/ ۲۱۳)۔

اِسی قول کو ''زہر الربیٰ'' (حاشیۃ النسائی ۹۳۸) میں علامہ سیوطیؒ نے بھی اِختیار فرمایا ہے۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ قول درست نہیں، کیوں کہ تھوڑی سے تحقیق وتدقیق سے اس کی مراد اور مفہوم کا تعین کیا جاسکتا ہے، لہٰذا اس کو متشابہات میں سے قرار دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟!۔

۲ــ قاضی عیاضؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قراءاتِ صحیحہ متواترہ تو سات سے کہیں زیادہ ہیں، اِس لیے یہاں ’’سبعہ‘‘ کا لفظ تحدید کے لیے نہیں، بلکہ تکثیر کے لیے ہے۔

مگر یہ قول بھی مسئلہ کی اصل حقیقت کی ترجمانی کرنے سے قاصر نظر آتا ہے، نیز احادیث میں جس سیاق وسباق کے ساتھ لفظِ ’’سبعہ‘‘ وارِد ہوا ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار کی درخواست پر ایک سے بڑھا کر سات تک کی اجازت دی گئی۔ اس کے پیشِ نظر بھی اس کو محض تکثیر پر محمول کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

۳ــ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد سات مشہور قاریوں کی قراءتیں ہیں۔

یہ رائے متاخرین میں سے بہت سے علماء نے اِختیار فرمائی ہے، چنانچہ فنِ تجوید کے امام علامہ ابن الجزری (ت ۸۳۳ھ) نے اپنے بعض پیش رووں کے حوالے سے اس کو نقل کیا ہے (اور پھر نہایت زوردار رد بھی فرمایا ہے)، اِسی طرح شارحِ مسلم علامہ اُبی (اِکمال اِکمال المعلم ۳/ ۱۶۵) نے اپنے اُستاذ ابوعبداللہ بن عَرفہ (ت ۸۰۳ھ) کا مختار مذہب اِسی کو قرار دیا ہے، اِسی طرح ملا علی قاریؒ (ت ۱۰۱۴ھ) نے ’’مرقاۃ المفاتیح‘‘ (۲۲۱۱) میں اِسی کو اِختیار کرتے ہوئے، حدیثِ مذکور کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں میں سے قرار دیا ہے، کہ آپ کی پیشین گوئی کے مطابق سات قراءات ہی متواتر ہوسکیں، اور باقی غیر متواتر ہونے کی وجہ سے شاذ قرار پائیں!۔

اپنے اکابر میں سے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے بھی پورے جزم سے اِسی رائے کو اِختیار فرمایا ہے (الفیض السمائی ۱/ ۵۲۴)۔

لیکن اِس رائے کو علمائے محققین نے کبھی بھی قبول نہیں فرمایا، بلکہ نہایت شد و مد سے اس کو رد فرمایا ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ:

ایک تو اِس قول کی بنیاد پر ’’قراءاتِ عشرہ‘‘ کا غیر متواتر ہونا لازم آتا ہے، حالاں کہ بغوی، ابن الصلاح، ابن تیمیہ، ابوحیان اندلسی، سُبکی، رحمہم اللہ، جیسے تمام محققین کی صراحت یہ ہے کہ اِن قراءاتِ عشرہ میں سے کسی میں بھی نماز جائز ہے۔

دوسرے قراءاتِ سبعہ کے علاوہ جو دوسری صحیح اور معتبر قراءتیں ہیں (جن میں ’’عشرہ‘‘ بھی ہے) ان کی تردید اور اِبطالِ کلی بھی لازم آتا ہے کہ پھر وہ کہاں سے آگئیں؟!

نیز ''مروجہ قراءتِ سبعہ'' کا جو علمی و تاریخی پس منظر ہے، اُس پر بھی یہ دعویٰ منطبق نہیں ہو پاتا، اِس لیے کہ محققین کے ہاں اِس کی جو تفصیل ملتی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صحابہ کو مختلف قراءتوں پر قرآن پڑھایا تھا، پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کی تدوین کی اور اُنھیں نقطوں اور اعراب سے خالی رکھا، تا کہ تمام مسلّمہ قراءتیں اس میں سما سکیں، اور ابتدائی مصاحف (جو چار، یا سات، یا آٹھ تھے) تیار کرا کے اسلامی سلطنت کے مختلف خطوں میں روانہ کیے، تو ان کے ساتھ ایسے قراء کو بھی بھیجا جو اس کی تلاوت سکھا سکیں۔

تو ان قراء میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی قراءتوں اور طرزِ اداء کے مطابق ہی لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں اور طرزِ اداء لوگوں میں عام ہو گیا، اور بحیثیتِ مجموعی قراءات کی ایک بڑی تعداد وجود میں آتی چلی گئی، بہت سے حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اس طرح علم قراءت کی بنیاد پڑ گئی، اور مختلف بلاد و امصار میں متعدد ماہرینِ فن اس میں ایسے ممتاز ہو گئے کہ لوگ قرآن کے سیکھنے سکھانے میں انھی کی طرف رجوع کرنے لگے، اور یہ تعداد پچاسوں اور سیکڑوں قراء کی تھی، جن کی قراءات اور طرزِ اداء کا حوالہ دیا جاتا تھا، اور لوگ اس سلسلے میں ان کو حجت تسلیم کرتے تھے۔

پھر عوام و خواص کے اختلاط اور اہل و نااہل کی عدمِ تمییز سے، تیسری صدی آتے آتے اس میں ایک بار پھر خلط و التباس کے خطرات محسوس کیے جانے لگے، اس موقع پر فقہ و لغت اور حدیث و قراءت کے مشہور امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ (ت ۲۲۴ھ) نے سب سے پہلی تصنیف فرمائی، جس میں انھوں نے قراء سبعہ سمیت تقریباً پچیس قاریوں کی قراءتیں جمع کیں، ان کے بعد احمد بن جُبیر بن محمد الکوفیؒ (ت ۲۵۸ھ) نے ''قراءاتِ خمسہ'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، پھر قالونؒ کے شاگرد قاضی اسماعیل بن اسحاق مالکیؒ (ت ۲۸۲ھ) نے اپنی تصنیف میں بیس ائمہ کی قراءات جمع کیں، جنمیں ائمۂ سبعہ بھی شامل ہیں۔ ان کے بعد امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری (ت ۳۱۰ھ) نے بیس سے سے زائد قراءات پر مشتمل ''الجامع'' نامی کتاب تصنیف فرمائی۔

پھر ان کے بعد اسی چوتھی صدی ہجری میں اور بھی بہت سے حضرات اس موضوع پر تصنیف

کرتے رہے، اوراُن قراءتوں کوجمع فرماتے رہے جواُن تک پہنچیں، امام ابومحمد مکی (ت ۴۳۷ھ) فرماتے ہیں کہ بہت سے حضرات نے اپنی کتابوں میں (۷۰) سے زائد ایسے قراء کا تذکرہ کیا جن میں سے بعض، ائمۂ سبعہ سے درجہ اور مرتبہ کے اعتبار سے اعلی وارفع ہیں، مزید برآں کہ علماء کی ایک جماعت نے اپنی تصانیف میں ان ائمۂ سبعہ میں سے بعض کے تذکرے کونظر انداز بھی فرمایا، جیسے ابوحاتم نے امام حمزہ، کسائی، اور ابن عامر کو چھوڑ دیا، اور ان کے علاوہ بیس ایسے قراء کا تذکرہ فرمایا جن میں سے بعض کا مقام ومرتبہ ان حضرات سے کہیں زیادہ فائق ہے! اسی طرح امام طبری، ابوعبید، اور قاضی اسماعیل نے بھی کیا۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ قراء اور قراءات کی اس کثرت اور تنوع کے باوصف، ان تمام تصنیفات اور مجموعات میں ایک اصولی ضابطہ اجماعی طور پر مسلّم تھا، وہ یہ کہ صرف وہ ہی قراءت، قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں (یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ قرآن کریم اپنی حفاظت، کتابت اور رسم الخط کے لحاظ سے تو بہرحال متواتر ہے، لہٰذا یہ تین شرطیں صرف اس رسم کے تلفظ وادائیگی کی صحت اور اس کے قابلِ قبول ہونے کے لیے ہیں):

۱- مصاحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس تلفظ اور اداء کی گنجائش ہو۔

۲- عربی صرف ونحو کے قواعد کے مطابق ہو۔

۳- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو۔

علامہ ابن الجزری ”النشر فی القراءات العشر“ میں فرماتے ہیں:

ہر وہ قراءت جو عربی کے قواعد کے مطابق ہو اور اس کی سند صحیح ہو تو وہ قراءتِ صحیحہ ہے، جس کا رد، یا انکار درست نہیں، بلکہ وہ اُن احرفِ سبعہ میں سے ہے جن پر قرآن نازل ہوا اور لوگوں پر اس کا قبول کرنا واجب ہے، خواہ وہ ائمہ سبعہ سے منقول ہو یا ائمہ عشرہ سے، یا ان کے علاوہ دیگر ائمۂ مقبولین سے، اور اگر ان تین ارکان میں سے ایک رکن بھی مفقود ہو تو اس پر قراءتِ شاذہ یا ضعف کا اطلاق ہوگا، خواہ وہ ائمۂ سبعہ ہی میں سے کسی سے منقول ہو۔

علامہ ابن الجزریؒ نے ان تین شرائط کو اپنے ”اَلْفِیَۃ“ (طَیِّبَۃُ النشر) میں بھی ذکر فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| فَكُلُّ مَا وَافَقَ وَجْهَ نَحْوِ | وَكَانَ لِلرَّسْمِ احْتِمَالاً يَحْوِي |
| وَصَحَّ إِسْنَاداً هُوَ الْقُرآنُ | فَهَذِهِ الثَّلَاثَةُ الأَرْكَانُ |

اورآگے یہ بھی فرمایا :

| | | |
|---|---|---|
| وحَيثُماَ يَختَلّ رُكنٌ أَثْبِت | | شُذُوذَهُ لَوْ أَنَّهُ فِي السَّبعَةِ |

یہاں یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ بعض حضرات کے ہاں ان شرائط میں ایک چوتھی شرط: ''متواتر ہونے'' کا بھی ذکر آ گیا ہے، مگر اِس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ جو چیز تواتر سے ثابت ہو اس میں مزید کسی شرط کی اور کسی قسم کے رد وقدح کی ضرورت ہی کہاں رہ جاتی ہے؟ اِس لیے اِس باب میں تحقیق وہ ہے جو محقق ابن الجزریؒ نے ذکر فرمائی ہے، وہ یہ کہ :

قراءت کی اولاً دو قسمیں ہیں : ''صحیحہ، غیر صحیحہ۔

پھر اول (صحیحہ) کی دو قسمیں ہیں : متواترہ، غیر متواترہ۔

متواترہ کے بارے میں تو کوئی بحث اور تردد ہے نہیں۔ اور غیر متواترہ کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اس کے اندر مذکورہ تینوں شرطیں بھی پائی جاتی ہوں، اور اس کو شہرت اور استفاضہ کا مرتبہ بھی حاصل ہو گیا ہو، تو ایسی قراءت بھی قراءاتِ متواترہ ہی سے ملحق ہے، حتی کہ اس سے نماز بھی درست ہے۔

دوسرے یہ کہ تینوں شرطوں کے علی الرغم شہرت کے مرتبہ تک نہ پہنچ سکی ہو، تو بہت سے علماء اس کو بھی اسی طرح قبول فرماتے ہیں، اور اس میں جوازِ صلوۃ کے قائل ہیں، مگر بغوی، ابن الصلاح اور سُبکی وغیرہ نے اس کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔

تیسرے یہ کہ اس کی سند بھی صحیح ہو، اور قواعدِ عربیت کے موافق بھی ہو، مگر رسم خطِ عثمانی کے مخالف ہو، تو ایسی قراءت شاذ کہلاتی ہے، جس کو بطور روایت کے تو بیان کیا جاسکتا ہے، مگر بطور تلاوت کے، یا نماز میں قراءت کے لیے اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور ثانی (غیر صحیحہ) وہ قراءت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سندِ صحیح کے ساتھ منقول نہ ہو، خواہ رسمِ خطِ عثمانی کے موافق بھی ہو، اور معنی کے لحاظ سے درست بھی ہو، ایسے کلمات کو قرآن کی طرف منسوب کرنا حرام اور مفضی الی الکفر ہے'' (ملخصاً وموضاً من ''منجد المقرئین ومرشد الطالبین''، ص ۱۸ : ۱۹، لابن الجزری)۔

بہر حال! مذکورہ بالا شرائط وضوابط کے تحت امت متواتر قراءتوں کو نقل کرتی رہی، اور علمائے محققین اپنے اپنے زمانہ اور علاقہ کی رائج قراءتوں کو کتابوں میں جمع فرماتے رہے، یہاں تک کہ چوتھی صدی کے

اوائل میں فن تجوید وقراءت کے امام الائمہ شیخ ابو بکر احمد بن موسی بن عباس بن مجاہد العراقی (ت ۳۲۴ھ) تشریف لائے، جنھوں نے ''کتاب السبعۃ فی القراءات'' کے نام سے کتاب تصنیف فرمائی، اور اُن ائمۂ سبعہ کی قراءات پر اکتفاء کا جواَب ''قراء سبعہ'' یا ''قراءات سبعہ'' کے نام سے معروف ومشہور ہیں۔ اللہ تعالی نے امام ابو بکر ابن مجاہدؒ کے اس انتخاب کو حسنِ قبول عطا فرمایا۔

پھر امام القراءات حافظ الحدیث العلامۃ المقرئ ابوعمرو عمادن بن سعید القرطبی الدانیؒ (ت ۴۴۴ھ) نے اپنی مشہورِ عالم کتاب ''التیسیر'' میں انہی قراء سبعہ کی قراءات کو، ہر ایک کے دو دو راویوں کے ساتھ مدون فرمادیا، حالاں کہ جس طرح قراء سبعہ کے علاوہ اور بھی بہت سے بڑے بڑے قراء اور ماہرینِ فن ائمہ تھے، اسی طرح خود اِن قراءِ سبعہ کے راویوں میں بھی اِن دو دو کے علاوہ بہت سے رُوات بھی تھے، مگر علامہ دانیؒ نے اپنی مجوزہ شرائط اور ترجیحات کی بنیاد پر یہ مجموعہ مرتب فرمایا۔

پھر علامہ ابومحمد القاسم بن فیرہ الرُّعینی الشاطبی (ت ۵۹۰ھ) نے ''التیسیر للدانی'' کو اپنے مشہور منظومہ ''حرز الأمانی'' میں نظم فرمادیا، اِن دونوں کتابوں کو بھی قبولِ عام حاصل ہوا، اور ان ہی کے ذریعے ان قراء سبعہ اور ان کی قراءات کو بھی فروغ حاصل ہوتا گیا، اور ساتھ ہی انحطاطِ زمانہ اور فتورِ ہمم سے لوگ بھی آہستہ آہستہ بس انہی کتابوں کی تعلیم وتحصیل پر اکتفاء کرنے لگے، یہاں تک کہ ساتویں اور آٹھویں صدی آتے آتے دیگر قراءات کی تحصیل واجازات کا سلسلہ ہی محدود ومفقود ہوتا چلا گیا۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

> ابن مجاہدؒ کا مقصد تو بس ''سبعۃ أحرف'' کی مناسبت سے اپنے زمانہ اور اپنے علاقہ کی سات مشہور تر قراءتوں کو جمع کرنا تھا، نہ کہ ان کے علاوہ قراءتوں کے ثبوت وصحت کا اِنکار کرنا (منجد المقرئین لابن الجزری، ص ۲۸)۔

حافظ ابن حجرؒ نے بھی ''فتح الباری'' (۴۹۹۲) میں بہت سے ائمہ مثلاً امام ابوشامہ، ابن عمار، مکی بن ابی طالب، ابوالعلاء الہمدانی اور ابوحیان رحمہم اللہ کے حوالے سے یہ بات ثابت کی ہے کہ ''احرفِ سبعہ'' قراءات سبعہ مشہورہ میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ ان کے علاوہ بھی قراءتیں متواتر ہیں اور ان کی تلاوت جائز ہے۔

اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ فنِ حدیث میں بخاری ومسلم نے مخصوص شرائط اور معیار پر اپنی ''صحیحین''

مرتب فرمائیں، اور منجانب اللہ ان کی کتابوں کو قبولِ عام بھی حاصل ہوا، مگر اس کا یہ مطلب کسی طرح بھی درست نہیں ہے کہ احادیثِ صحیحہ، بخاری ومسلم کے علاوہ کہیں اور ہیں ہی نہیں، جیسا کہ خود امام مسلمؒ نے صراحت کے ساتھ اِن الفاظ میں اِس کی وضاحت فرمائی ہے: **ليس كل شيء عندي صحيح وضعته ههنا، إنما وضعت ههنا ما أجمعوا عليه** (صحیح مسلم ۴۰۴)۔

حضرت قاری ابوالحسن صاحب مدظلہم لکھتے ہیں :

> اسی طرح سبعہ کے بعد کی بھی تین قراءات غائب ہوجاتیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ابن مہران (ت ۳۸۱ھ)، ابن غلبون (ت ۳۸۹ھ)، ابن شیطا (۴۴۵)، اہوازی (ت ۴۴۶ھ)، قلانسی (ت ۵۲۱ھ)، ابو العلاء (ت ۵۶۹ھ) اور محقق ابن الجزری (ت ۸۳۳ھ) رحمہم اللہ کو توفیق عطا فرمائی، اور یہ (ان کے) پڑھنے پڑھانے اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے، ساتھ ہی ساتھ اہلِ مصر بھی خدمت کرتے رہے، اِس لیے (یہ) محفوظ رہ گئیں" (علمِ قراءات اور قراءِ سبعہ ص ۶۴)۔

اِن تفصیلات اور تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے، حدیث میں وارِد "سبعۃ أحرف" سے مراد "ائمہ سبعہ مشہورہ" کی قراءات کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔

یہی وجہ ہے کہ اِس زمانہ میں بھی "قراءاتِ سبعہ" کے ساتھ ساتھ، "عشرہ" میں بھی نماز بلا اختلاف اور بلا تردد جائز ہے، اِس لیے کہ ان میں سب سے پہلے تو تواتر ہی پایا جاتا ہے، جس کے ہوتے ہوئے کسی اور شرط کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی، اور ویسے مذکورہ تینوں شرائط پر بھی یہ قراءتیں پوری اترتی ہیں، اور جہاں تک "عشرہ" سے زائد باقی تین مشہور قراءت کی ہے، تو ان کے بارے میں محقق ابن الجزریؒ نے صراحت فرمائی ہے کہ ان میں تلاوت تو جائز ہے، البتہ نماز کے بارے میں محققین نے ممانعت فرمائی ہے، اِس لیے کہ ان میں بہت سے کلمات خلافِ شرائط اور خلافِ جادہ ہیں (منجد المقرئین ص ۲۵، وردّ المحتار ۱/ ۴۸۶)۔

اور ان کے علاوہ جو قراءات متفرق طور پر کتابوں میں پائی جاتی ہیں چوں کہ اَب وہ منضبط اور مرتب بھی نہیں ہیں، یا رسم عثمانی کے موافق نہیں ہیں، یا اسانیدِ صحیحہ سے مروی نہیں ہیں، اِس لیے باتفاقِ فقہاء اُن میں نماز درست نہیں۔ واللہ اعلم

# رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اوران کے برگزیدہ صحابہ کی
# پاکیزہ زندگی کے تابندہ نقوش

گذشتہ سے پیوستہ

## (صفحات مشرقة من حياة الرسول وصحابته الأبرار)

لمحمد علي الصلابي

ترجمہ مع اضافات : مولانا محمد حیان بیگ استاذ شعبۂ تفسیر مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور

## بازاروں میں آپ ﷺ کا اہلِ عرب کو تبلیغ کرنا

مذکورہ واقعہ کے بعد آپ ﷺ باقاعدہ علی الاعلان دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے لگے، آپ علیہ السلام لوگوں کے پاس بازاروں اور محفلوں میں جاتے، اور انہیں کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کو پڑھنے کی دعوت دیتے، کچھ لوگ تو اس پر خاموشی اختیار کرتے، اور بعض آپ کی بات قبول کر لیتے اور اسلام لے آتے، اور کچھ ایسے بدبخت بھی تھے جو بات سننے کے بجائے مذاق اڑاتے، تمسخر کرتے: آپ علیہ السلام ابتداء میں لوگوں کو صرف توحید کی دعوت دیتے تھے، تمام احکامِ اسلام اور شریعت کی انہیں دعوت نہ دیتے، صرف انہیں لا الٰہ الا اللہ پڑھنے، اور بت پرستی چھوڑنے کا مکلف بناتے۔

آپ علیہ السلام جب گھر سے باہر نکلتے اور اہلِ مکہ کو دیکھتے کہ وہ خرید وفروخت میں مشغول ہیں، تو ان کے پاس جا کر ان سے فرماتے: اے لوگو! کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھ لو کامیاب ہو جاؤ گے، اور تم اس کلمہ کی برکت سے تمام اقوامِ کے سردار بن جاؤ گے، رسولِ پاک ﷺ کا بدبخت چچا ابولہب حضور ﷺ کے دعوتی مشن کو بگاڑنے کے لیے اپنا کام کاج چھوڑ کر حضور علیہ الصلاۃ والسلام کے پیچھے ہو لیتا، اور جہاں بھی حضور جاتے یہ بھی ساتھ ساتھ رہتا، بالکل پیچھا نہ چھوڑتا، اور لوگوں سے یہ کہتا پھرتا: لوگو! میرا یہ بھتیجا ناسمجھ اور دیوانہ ہے، اس لیے نہ تو اس کی تصدیق کرنا، اور نہ ہی اس کی بات سنا۔

ربیعۃ بن عبادؓ (جو پہلے غیر مسلم تھے، بعد میں اسلام لائے) فرماتے ہیں کہ: میں نے رسولِ پاک ﷺ

کو زمانۂ جاہلیت میں ایک مرتبہ بازار (سوق ذی المجاز) میں دیکھا کہ وہ لوگوں کو توحید کی طرف بلا رہے ہیں، اور فرما رہے ہیں کہ: لوگو! ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' پڑھ لو کامیاب ہو جاؤ گے، بہت سے لوگ آپ ﷺ کے پاس جمع تھے، اور پیچھے گورے رنگ کا ایک آدمی کھڑا تھا، جس کی دو چٹیا تھیں، وہ لوگوں سے یہ کہتا پھر رہا تھا کہ: لوگو! اس شخص کی بات مت سنو، یہ اپنے آباء و اجداد کے دین سے بیزار شخص ہے، اور بہت بڑا جھوٹا بھی ہے، یہ چاہتا ہے کہ تم لوگ لات و عزّٰی کی عبادت چھوڑ دو، راوی یعنی ربیعہ بن عباد کہتے ہیں کہ: میں نے لوگوں سے پوچھا کہ: یہ آدمی کون ہے؟ تو لوگوں نے مجھے بتایا: یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (رواہ أحمد فی المسند، وانظر تفسیر ابن کثیر ۳/ ۶۸۷)

## مشرکین کا ابو طالب کے پاس جا کر شکایت کرنا

آپ علیہ السلام پوری جانکاہی کے ساتھ دعوت و تبلیغ کرتے رہے، ادھر قریش کو یہ ڈر ستانے لگا کہ کہیں محمد کے پیروکاروں کی تعداد میں مزید اضافہ نہ ہو جائے، اور دیگر لوگ ان پر ایمان لانا نہ شروع کر دیں! چنانچہ ایک روز قریش اکھٹا ہو کر ابو طالب کے پاس پہنچے (ابو طالب ہی رسولِ پاک ﷺ کی دیکھ ریکھ کرتے تھے، اور نادان، اور بدکار کافروں کے شرور و فتن سے حضور ﷺ کی حفاظت فرماتے تھے) قریش بولے: اے ابو طالب! آپ اپنے بھتیجے کو ہم سے دور رکھیں، وہ ہمارے دین کو غلط ٹھہراتا ہے، اور ہمیں نادان سمجھتا ہے، اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے، ہم اس چیز کو بالکل برداشت نہیں کر سکتے، اور وہ جو کر رہا ہے ہم اسے اس کی اجازت نہیں دے سکتے، ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اسے ان حرکتوں سے باز رکھیں!

ابو طالب نے حضور ﷺ کو قاصد بھیج کر اپنے پاس بلوایا، جب آپ ﷺ تشریف لے آئے، تو ابو طالب بولے: اے میرے برادر زادے! دیکھو تمہاری قوم کے لوگ تمہاری شکایت کر رہے ہیں، ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ: تم ان کے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہو، اور انہیں نادان سمجھتے ہو، اور ان کے بارے میں بہت کچھ بولتے ہو؟ جب ابو طالب خاموش ہو گئے، تو حضور ﷺ نے فرمایا: میرے چچا جان! میں ان سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ ایک کلمہ پڑھ لیں، اگر یہ اسے پڑھ لیں گے تو سارا عرب ان کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا، اور سارا عجم ماتحت ہو کر انہیں جزیہ دینے لگے گا، یہ سن کر ابو جہل جوش میں اٹھا اور بولا کہ: تم صرف ایک کلمہ کی بات کرتے ہو، میں تمہیں تمہارے باپ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ ہم ایک نہیں، دس کلمات کہنے

کوتیار ہیں، بتاؤ تو سہی کہ وہ کون سا کلمہ ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: تم سب لا إلہ إلا اللہ پڑھ لو!، یہ سننا تھا کہ سب کے سب چیں بجبیں ہوکر مجلس سے کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، اور ازراہِ تمسخر کہنے لگے: **أجعل الألهة إلهًا واحدًا إن هذا لشيء عجاب، وانطلق الملأ منهم أن امشوا واصبروا على ءالهتكم إن هذا لشيء يراد، ما سمعنا بهذا في الملة الأخرة، إن هذا إلا اختلٰق۔**

کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک ہی معبود میں تبدیل کردیا ہے؟ یہ تو انتہائی عجیب بات ہے۔ اور ان میں کے سردار لوگ یہ کہہ کر چلتے بنے کہ: چلو، اور اپنے خداؤں کی عبادت پر ڈٹے رہو! یہ بات تو ایسی ہے کہ اس کے پیچھے کچھ اور ہی ارادے ہیں۔ (یعنی یہ محمد ﷺ ان باتوں کے ذریعہ معاذ اللہ اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔) ہم نے تو یہ بات پچھلے دین میں کبھی نہیں سنی؛ اور کچھ نہیں، یہ محض ایک من گھڑت بات ہے۔

لفظِ ''عُجاب'' لفظِ ''عجیب'' سے زیادہ بلیغ ہے، اس لیے کہ: ''عُجاب'' ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جس کا کوئی ہم مثل نہ ہو، گویا کہ وہ اتنا عجیب وغریب ہو کہ اس کو سمجھنا ایک پہیلی ہو، یہی وجہ ہے کہ ان کفارِ قریش نے حضور کی دعوت سے تکبر کرکے منہ موڑ لیا، اللہ تبارک وتعالی ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: **إنهم كانوا إذا قيل لهم لا إله إلا الله يستكبرون، ويقولون أئنا لتاركوا ءالهتنا لشاعر مجنون۔ (الصافات)**

ان کا حال یہ تھا کہ جب ان سے یہ کہا جاتا کہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو یہ اکڑ دکھاتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ: کیا ہم ایسے ہیں کہ ایک دیوانے شاعر کی وجہ سے اپنے معبودوں کو چھوڑ بیٹھیں؟

اور ان کفار نے دعوتِ توحید کو اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ اتنی بڑی دنیا میں صرف ایک ہی معبود کیسے ہوسکتا ہے؟ یعنی ساری انسانیت کو صرف ایک ہی معبود کی عبادت کافی کیسے ہوسکتی ہے؟ اور ان لوگوں نے اپنی نادانی کی بنا پر کعبہ کے ارد گرد سال کے دنوں کی تعداد کے مطابق کم وبیش تین سو ساٹھ بت نصب کر رکھے تھے؛ پھر فتحِ مکہ کے موقع پر رسولِ پاک علیہ الصلاۃ والسلام نے ان سارے بتوں کو مسمار کردیا تھا، اور اپنی زبانِ مبارک سے آپ ﷺ یہ آیت تلاوت فرمارہے تھے: **جاء الحق وزهق البطل، إن البطل كان زهوقًا۔ (الإسراء: ۸۱)**

حق آن پہنچا، اور باطل مٹ گیا، اور یقیناً باطل مٹنے والی چیز ہے۔

الغرض انہی مذکورہ وجوہات کی بنیاد پر یہ کفار اِن معبوادانِ باطلہ کی عبادت ترک کرنے کو تیار نہیں تھے، اور یہ کہتے تھے کہ: کیا اس نے اتنے سارے معبودوں کو ایک کر دیا ہے، یہ تو انتہائی عجیب وغریب بات ہے۔

کس قدر احمق اور نادان تھے یہ! ایسے پتھروں کی عبادت کرتے تھے جن میں سنے، بولنے، اور دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی، نہ وہ کسی کی بات سن سکتے تھے، اور نہ ہی کسی کی مدد کر سکتے!، ایسے ناکارہ پتھروں کی خاطر ان احمقوں نے خدائے وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کو چھوڑ دیا!

## ابوطالب کی وفات کے بعد رسول پاک ﷺ کے خلاف ایذا رسانی کی انتہا

چچا ابوطالب کی وفات کے بعد رسولِ کریم علیہ السلام کے اوپر کفار ومشرکین کی جانب سے مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اور ان لوگوں نے آنحضور ﷺ کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، حتی کہ یہ لوگ نماز میں سجدہ کے دوران آپ ﷺ کی پشتِ مبارک پر لید، گوبر وغیرہ تک ڈال دیا کرتے۔

عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ رسولِ پاک ﷺ مسجد میں تھے، اور قریش کے سات بڑے سردار ابوجہل، شیبہ، عقبہ وغیرہ حجرِ اسماعیل (حطیم) میں موجود تھے، آنحضور ﷺ جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے، تو ابوجہل بولا کہ: تم میں سے کون فلاں فلاں کے گھر جا کر اونٹنی کی بچہ دانی کی جھلی گندگی سمیت لے کر آئے گا، تا کہ ہم اس کو سجدہ کی حالت میں محمد کی پشت پر ڈال دیں، یہ سن کر بدبختِ زمانہ عقبہ بن ابی معیط اٹھا، اور گندگی لے کر ان کے پاس پہنچ گیا، جب رسول کریم علیہ السلام سجدہ میں گئے، تو ان بدنصیبوں نے حضور کی پشتِ مبارک پر گندگی ڈال دی، آپ ﷺ نے اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق طویل سجدہ فرمایا، اور یہ سب کھڑے ہو کر قہقہے مارنے لگے، اور مذاق بنانے لگے۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: میں کھڑا یہ سب منظر دیکھ رہا تھا لیکن نہ میں کچھ بول سکتا تھا، اور نہ ہی کچھ کر سکتا تھا، میرے پاس اتنی قوت اور زور نہ تھا کہ میں ان کے شر اور فتنہ سے بچ سکوں؛ رسولِ پاک ﷺ سجدہ کرتے رہے، اور آپ نے سر نہیں اٹھایا، حالانکہ لید اور گندگی آپ کی پشت پر پڑی ہوئی تھی، حضرت فاطمہ کو جب اس کا علم ہوا تو وہ دوڑتی ہوئی آئیں، اور ان بدبختوں کو سخت سست کہا، حضرت فاطمہؓ اس وقت کم سن تھیں، اس لیے ان لوگوں نے کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا، اور نہ ہی کوئی زیادتی کی، پھر

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ساری گندگی اٹھا کر دور پھینک دی، اور کھڑے ہو کر اپنے والدِ ماجد کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگیں، جب آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہو گئے، تو آپ نے ان کے خلاف ان الفاظ میں بددعا کی :اے اللہ! قریش کی گرفت فرما! (آپ نے یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے) اے اللہ! عتبہ، عقبہ، ابوجہل، شیبہ پر گرفت فرما، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ بددعا سن کر کفار سہم گئے، اور ان کی ساری ہنسی کافور ہوگئی، اور ان کی اس طرح بولتی بند ہوگئی جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

راوی کہتے ہیں کہ: خدا کی قسم، جن لوگوں کے خلاف رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس روز بددعا کی تھی، ان سب کو میں نے جنگِ بدر کے دن مرا ہوا پڑا دیکھا، وہ سب کے سب مارے گئے، ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا، پھر سب کو گھسیٹ کر بدر کے کنویں میں ڈال دیا گیا، ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ بعد میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کنویں کے کنارے جا کر کھڑے ہو گئے، اور ان کو ان کا برا انجام یاد دلانے لگے، اور ان کے ناموں سے ان کو پکار کر کہنے لگے کہ: اے فلاں بن فلاں! اے ابوجہل! عتبہ! عقبہ!، اسی طرح رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سات لوگوں کے نام لئے، اور فرمایا: تمہارے پروردگار نے جو وعدہ تم سے کیا تھا، کیا تم نے اسے سچا پایا؟ میرے پروردگار نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا تھا، میں نے اسے بالکل سچا پایا ہے؛ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں آپہنچے، اور دریافت کیا کہ: اے اللہ کے رسول! کیا آپ اِن سڑی ہوئی مردار گدھے کے مانند لاشوں سے باتیں کررہے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو میں بول رہا ہوں وہ ان کو بھی اتنا ہی سنائی دے رہا ہے جتنا تمہیں، بس فرق یہ ہے کہ تم تو بول سکتے ہو، اور یہ بول نہیں سکتے۔ (أخرج هذه القصة الشيخان، والإمام أحمد، والبزار، والطبراني بألفاظ مختلفة)

تبرکاتِ اکابر

# ملفوظات

## از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

مرتب: مولانا مفتی شعیب احمد بستوی

معین مفتی دارالافتاء مظاہر علوم سہارنپور

**فرمایا**: یہ تبلیغ کا کام بھی ایک حکیمانہ کام ہے اس میں بڑی فہم اور بڑی عقل کی ضرورت ہے، کہ کس محل میں کیا اور کس عنوان سے کہنا ہے۔

**فرمایا**: دعاء بڑی چیز ہے، تمام عبادات کا مغز ہے، اور سب سے زیادہ آج کل اسی سے غفلت ہے، دنیا کے کاموں کے واسطے بھی دعاء مانگنا عبادت ہے بشرطیکہ وہ کام شرعاً جائز ہوں، یہ غلطی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ دین ہی کے کاموں کے واسطے اور آخرت ہی کی فلاح و بہبود کے لئے دعا عبادت ہے، بعض لوگ بجائے درخواست دعا کے لکھتے ہیں کہ فلاں کام کے لئے کوئی مجرب عمل اور کوئی مجرب وظیفہ بتادیجئے، اس پر میں لکھ دیتا ہوں کہ اس قید کے ساتھ مجھ کو کوئی عمل معلوم نہیں اور دعاء سے بڑھ کر کوئی عمل اور وظیفہ نہیں۔

**فرمایا**: کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک استاذ الاستاذ بزرگ کا قول نقل فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کو دین کا بنانا ہو تو درویش کے سپرد کردو، اور دنیا کا بنانا ہو تو طبیب کے سپرد کردو اور اگر دونوں سے کھونا ہو تو شاعر کے سپرد کردو۔

**فرمایا**: میں سب سے زیادہ مشکل چیز فقہ کو سمجھتا ہوں اور لوگوں کو اکثر اسی پر دلیر پاتا ہوں، بہت سوچ سمجھ کر مسئلہ بیان کرنے کی ضرورت ہے، فقہاء نے تو کوئی چیز نہیں چھوڑی سچ تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ان حضرات کو الہام ہوتا تھا جس کی وجہ سے دین کی ایسی خدمت کی ہے حق تعالیٰ ان کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

**فرمایا**: ناصحین حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی طرف التفات مت کرو اور میں کہتا ہوں کہ خوب التفات کرو، کیونکہ جب دنیا کی حقیقت کو خوب سوچو گے اور اس کے ساتھ آخرت کو بھی، تو موازنے کے بعد دین ہی کو دنیا پر ترجیح دو گے بلکہ میں اس میں اور توسع کرتا ہوں کہ موازنے کے لئے بھی نہ سوچو بلکہ

محض اس کی حقیقت ہی سے واقف ہونے کے لئے اس میں غور وفکر کرو اور خوب توجہ کرو تا کہ اس مردار کی حقیقت واضح ہو جائے اور پھر کامل درجہ کی اس سے نفرت ہو۔

نوٹ : قرآن وحدیث میں انہماک فی الدنیا سے منع کیا گیا ہے جو دین سے دوری اور بیزاری کا سبب بنتا ہے، التفات فی الدنیا (دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری پر غور وفکر) یہ ممنوع نہیں ہے، اس ملفوظ میں حضرت کی مراد غالبا یہی ہے (اضافہ : از بندہ شعیب احمد)۔

**فرمایا**: برا بھلا اور ناگوار بات کہنے والوں نے کس کو چھوڑ دیا؟ اللہ کو چھوڑ دیا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا، ائمہ مجتہدین کو چھوڑ دیا؟ اور بعد کے علماء دین اور بزرگان دین کس شمار میں ہیں۔

مگر کسی کے برا بھلا کہنے سے برا کیوں مانے، اس سے بگڑتا کیا ہے، معاملہ تو اللہ کے ہاتھ ہے مخلوق سے لینا ہی کیا ہے، اور اگر کسی کو اس کی فکر ہے تو یہ اچھی خاصی مخلوق پرستی ہے پھر خدا پرستی کہاں، اور یہ فکر خود ایک مستقبل اور بہت بڑا عذاب ہے کہ فلاں برا نہ کہے فلاں بھلا نہ کہے، کون بیٹھا ہوا ان خرافات کا مراقبہ کیا کرے، ایسے موقع کے لئے ذوق نے کیا خوب کہا ہے:

| | | |
|---|---|---|
| تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق | | ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے |
| اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے | | پھر برا کہنے سے کیوں اس کے برا مانتا ہے |

**فرمایا**: یہ اصلاح کا باب بڑا ہی نازک ہے بدون مہارت فن کے مشکل ہے کہ کسی کی اصلاح کر سکے۔

**فرمایا** : آج کل بعض لوگوں کہ یہ مرض ہے کہ وہ بیٹھے ہوئے ادھر ادھر کی ہانکا کرتے ہیں، یا دل ہی دل میں فضول مسودے گانٹھا کرتے ہیں حتی کہ بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر بھی ان وساوس میں آلودہ رہتے ہیں، ایک شخص نے مجھ سے خود بیان کیا کہ میں حضرت حاجی صاحب (حاجی امداد اللہ صاحب) کی خدمت میں بیٹھا ہوا دل دل میں کہہ رہا تھا کہ معلوم نہیں عند اللہ حضرت حاجی صاحب کا مرتبہ زیادہ ہے یا حافظ ضامنؒ صاحب کا، حضرتؒ اس خطرے اور وسوسے پر منجانب اللہ مطلع اور آگاہ ہو گئے، فرمایا : میاں تم کو اس سے کیا بحث؟ بادل کا ہر ٹکڑا سیراب کرنے کے لئے کافی ہے پھر تم کو اس کی کیا فکر کہ ان میں کون سا ٹکڑا بڑا ہے اور کون سا چھوٹا ہے۔ (ماخوذ از : حکیم الامت کی محفل ارشاد)

واقعات الفتاویٰ

# فتاوی مظاہر علوم

مفتی بشیر احمد سہارنپوری
نائب مفتی دارالافتاء مظاہر علوم سہارنپور

## عورتوں کا جوڑا باندھنا اور اس حال میں نماز پڑھنا:

عورتوں کا (گُدّی پر) بالوں کا جوڑا باندھنا جائز ہے اور جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا بھی جائز ہے، بلکہ ان کے لئے جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا اولی ہے، تا کہ بالوں کی بے ستری کا امکان نہ رہے، البتہ مردوں کے بال اگر بڑے ہوں تو ان کے لئے ایسا کرنا مکروہ وممنوع ہے، عوام عورتوں کے لئے بھی اس کو ممنوع سمجھتے ہیں، جو ناواقفیت ہے:

**عن ام سلمۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی ان یصلی الرجل ورأسہ معقوص (رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ رجال الصحیح) وقال العراقی :وھو مختص بالرجال دون النساء لان شعرھن عورۃ یجب سترہ فی الصلوۃ فاذا نقضتہ ربما استرسل وتعذر سترہ فتبطل صلاتہا** (اعلاء السنن ۵/ ۱۱۳ — امداد الاحکام ۴/ ۳۳۷)

## میراث کی تقسیم میں تاخیر کرنا:

عام ماحول یہ ہے کہ میت کے انتقال کے بعد اس کی میراث کی تقسیم میں ٹال مٹول سے کام لیا جاتا ہے، بسا اوقات کئی پشتوں تک میراث کو تقسیم نہیں کیا جاتا، اس میں بہت سی دینی ودنیوی خرابیاں پائی جاتی ہیں اور یہ بہت سے تنازعات اور جھگڑوں کا پیش خیمہ بنتا ہے، اس لئے بلا کسی معقول وجہ کے اس میں تاخیر مناسب نہیں ہے، بالخصوص اگر کوئی وارث صراحۃً یا دلالۃً تقسیم کا طالب ہو تو اس کے حصہ کی ادائیگی یا کوئی وارث نابالغ یا ناعاقل ہو تو اس کے حصہ کی علیحدگی فوراً ضروری ہے۔ (ملاحظہ ہو: احکام میت از ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ ص ۳۱۶)

## گاہک مہیا کرنے کے کمیشن کا حکم:

بازار میں لوگ دوکاندار کے پاس گاہک لے کر آتے ہیں اور دوکاندار سے اس کا کمیشن وصول کرتے ہیں، اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) دوکاندار کے پاس گاہک کو خود لے کر جایا جائے اور اس پر کمیشن وصول کیا جائے ، یہ جائز ہے، کیونکہ گاہک لے جانا ایک عمل ہے، جس کی اجرت وصول کی جاسکتی ہے۔

(۲) گاہک کو دوکاندار کا پتہ بتا دیا جائے اور گاہک اس پتہ پر خود پہنچے، اس صورت میں کمیشن لینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ازروئے شرع محض پتہ بتلانا ایسا عمل نہیں ہے کہ جس کی اجرت وصول کی جاسکے۔

پھر اجرت لینے دینے کی بھی دو صورتیں ہیں:

(۱) دوکاندار ہر گاہک پر متعینہ اجرت دے، مثلاً : پچاس روپئے، سو روپئے، یہ جائز ہے۔

(۲) اجرت کو گاہک کی خریداری پر معلق کر دیا جائے اور اس کی خریداری کے فیصد کے لحاظ سے اجرت دیجائے ، یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں اجرت موہوم ہے، معلوم نہیں گاہک خرید سکے گا یا نہیں؟ پہلی صورت میں اس کو اجرت مل جائے گی دوسری صورت میں نہیں ملے گی ، اور غیر متعین بھی ہے کہ خریداری کی مقدار کے لحاظ سے کم وبیش ہو جائے گی، اور اجرت کا اس طرح تعین ناجائز ہے۔

**رجل ضل له شئ فقال من دلنی علی کذا فله کذا فهو علی وجهين :ان قال ذلک علی سبيل العموم بان قال :من دلنی فالاجارة باطلة لان الدلالة والاشارة ليست بعمل يستحق به الاجر، وان قال علی سبيل الخصوص بان قال لرجل بعينه :ان دللتنی علی کذا فلک کذا، ان مشی له فدله فله اجر المثل للمشی لاجله لان ذلک عمل يستحق بعقد الاجارة الا انه غير مقدر بقدر فيجب اجر المثل، وان دله بغير مشی فهو والاول سواء**

(ردالمحتار زکریا ۹ / ۱۳۰ – ۱۳۱)

## نیٹ ورک مارکیٹنگ کاروبار کا حکم :

کمپنیوں کے کاروبار کا ایک یہ طریقہ بھی رائج ہے کہ کہ وہ سامان کی فروختگی کے ساتھ خریدار کے ساتھ یہ معاملہ بھی کرتی ہیں کہ وہ مزید خریدار تلاش کرے، جس پر وہ اس کو کچھ کمیشن بھی دیتی ہیں، پھر اس خریدار کے واسطہ سے آنے والا خریدار بھی اور خریدار تلاش کرتا ہے اور کمپنی اس کو بھی کمیشن دیتی ہے اور اس کے ساتھ اس پہلے خریدار کو بھی کمیشن دیا جاتا ہے جس کے توسط سے اس دوسرے خریدار کا رابطہ کمپنی سے قائم ہوا تھا، اس طرح یہ سلسلہ اسی طرز پر پھیلتا چلا جاتا ہے، یہ طریقہ نیٹ ورک مارکیٹنگ کہلاتا ہے اور معمولی

فرق کے ساتھ اس کی بہت سی شکلیں رائج ہیں۔

اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ چونکہ اس طریقۂ کاروبار میں متعدد خرابیاں اور مفاسد پائے جاتے ہیں، اس لئے اس نیٹ ورک میں شمولیت ناجائز ہے اور اس سے حاصل شدہ آمدنی بھی حلال نہیں ہے، اس کی بنیادی خرابیاں درج ذیل ہیں:

(۱) صفقۃ فی صفقۃ، یعنی ایک ساتھ دو معاملے، چنانچہ خریداری کے ساتھ ممبر سازی کا عمل مشروط ہوتا ہے۔

(۲) غرر، بایں معنی کہ اگر ممبر سازی میں کامیابی ہوگئی تو محنت وصول ہو جائے گی ورنہ محنت رائیگاں جائے گی۔

(۳) اجرت بلا عمل، بایں طور کہ واسطہ در واسطہ بنے ہوئے ممبر کے نفع کا بھی استحقاق ہوتا ہے۔

(۴) شبۂ قمار، یہ اس طرح ہے کہ اس میں اصلا واسطہ بلا واسطہ ممبر سازی کے ذریعہ نفع کمانا پیش نظر ہوتا ہے، سامان کی خریداری برائے نام ہوتی ہے اور سامان گھٹیا بھی ہوتا ہے جبکہ قیمت زائد وصول کی جاتی ہے، مگر خریدار اس کو اس لئے برداشت کرتا ہے کہ وہ ممبر سازی کے ذریعہ اس نقصان کی تلافی کا خواب سجائے ہوئے ہوتا ہے، جو کبھی شرمندہ تعبیر ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں ہو پاتا ہے۔

(ملاحظہ ہو: فقہ البیوع ۲/ ۸۱۲ نیٹ ورک مارکیٹنگ: شرعی نقطۂ نظر، از اسلامک فقہ اکیڈمی۔)

## حلال روزی کی کوشش پر اجر وثواب:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حلال حاصل کرنے کی فکر و کوشش فرض کے بعد فریضہ ہے۔

”عن عبداللہ قال قال رسولُ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلیہِ وَسَلَّمَ: طَلَبُ کَسبِ الْحَلاَلِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ“۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، رواہ الطبرانی ۱۰/رقم: ۹۹۹۳)

اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے کسی فریضہ کا ادا کرنا اس کی بندگی اور عبادت ہے اور بندہ اس پر اجر وثواب کا مستحق ہے، تو کسبِ حلال کی فکر و کوشش اور اس میں مشغول ہونا بھی دین وعبادت اور اجر وثواب کا باعث ہے۔

R.N.I. REGD. NO. 62469/95U.M.

URDU MONTHLY MAGAZINE

# MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR



Rs.30/

MADRASA MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR-247001 (U.P.) INDIA, PH. 0132-2655542

E-Mail: jamiamazahir@gmail.com

Al Fazl Commputer Sre. 9359209995